حیات سعدی

خواجہ الطاف حسین حالی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند
ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066
بہ اشتراک
اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

حیات سعدی

خواجہ الطاف حسین حالؔی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند
ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066
بہ اشتراک
اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کررہی ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے اس نے مختلف اقدام کیے ہیں جن میں کمپیوٹر اپلیکیشن، ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔، کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن اور اردو رسم الخط میں سرٹیفکیٹ کورس شامل ہیں۔ ان اقدامات کے ذریعے اردو زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے اردو تعلیم کے منظرنامے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کوشش کو بڑی حد تک کامیابی بھی ملی ہے۔

قومی اردو کونسل کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابوں کی طباعت اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اس لیے اردو زبان کا وہ کلاسیکی سرمایہ جو دھیرے دھیرے نایاب ہوتا جارہا ہے، قومی اردو کونسل نے اس کی مکرر اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔

اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کے کارہائے نمایاں میں سے ایک اہم کام ان اردو کتابوں کی ترتیب و تہذیب اور ان کی اشاعت ہے جن کا شمار اردو کے کلاسیکی سرمائے میں ہوتا ہے۔ ان کتب کی اردو شائقین کے حلقوں میں جس قدر پذیرائی ہوئی ہے وہ محتاج بیاں نہیں۔ اس لیے اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کی تمام مطبوعات کو ان کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل ایک مشترکہ معاہدے کے تحت ازسرنو شائع کرے گی۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

حیاتِ سعدی

فہرست

دیباچہ

مشہور آدمیوں کا حال لکھنا جس کو یونانی میں بیوگرافی اور عربی میں ترجمہ یا تذکرہ کہتے ہیں کم وبیش قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ اگر چہ اُس وقت زیادہ تر بہادروں کے معرکے اور دیوتاؤں کے کرشمے لوگوں کو اکثر زبانی یاد ہوتے تھے جو مناسب موقعوں پر بیان کیے جاتے تھے۔ لیکن یہودیوں کے ہاں قدما کی سرگذشتیں بھی لکھی جاتی تھیں۔ یہودیوں کے بعد یونانیوں اور رومیوں نے اِس طرف توجہ کی۔ چنانچہ یونان کے مشہور بیوگرافر پلوٹارک کی بیوگرافی جو دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی اُس عہد کے تذکروں میں ممتاز اور برگزیدہ ہے۔

اور عیسائیوں کے مذہبی لڑیچر میں اُس زمانے کے اولیاء، شہدا اور مجتہدوں کی سوانح عمری جو کسی قدر مکمل ہیں کثرت سے موجود ہیں۔ زمانہ متوسط میں مسلمانوں کی بیوگرافی سب سے زیادہ وقعت کے قابل ہے۔ لیکن اِن دونوں زمانوں میں تذکرہ لکھنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے حالات محض بطور روایت کے بیان کرتے تھے درایت کو اس میں کچھ دخل نہ دیتے تھے اور بیان میں مبالغہ کو زیادہ کام میں لاتے تھے۔ مسلمانوں کی بیوگرافی میں بھی یہی عام خاصیت پائی جاتی ہے۔ صرف رجال حدیث کے حالات جو محدثین نے لکھے ہیں اُن میں البتہ بہت احتیاط کی گئی ہے ہر ایک شخص کے اخلاق اور خصائل راست راست بے کم وکاست لکھے گئے ہیں اور ان کے عیب اور خوبیاں پوست کندہ بیان کی گئی ہیں۔ باقی علماء اور شعرا وغیرہ کے تذکرے اکثر ایسے نہیں ہیں۔ اور چونکہ تذکرہ نویسی کا مدار محض نقل اور روایت پر تھا اس لیے اُن لوگوں کے سوا جن کے حالات تاریخ میں مفصل لکھے گئے ہیں جیسے (خلفاء سلاطین، وزرا اور سپہ سالار وغیرہ) باقی تمام اہلِ کمال کے حالات مختصر طور پر تحریر ہوئے ہیں۔ اور مشہور سے مشہور مصنف کی لائف بھی جداگانہ نہیں لکھی گئی۔ زمانہ حال میں یورپ کے مورخوں نے خاص کر سترہویں صدی سے بیوگرافی کو بے انتہا ترقی دی ہے۔ یہاں تک کہ

تاریخ کی طرح بیوگرافی نے بھی فلسفہ کی شکل اختیار کی ہے۔ حال کی بیوگرافی میں اکثر مؤرخانہ تدقیق کی جاتی ہے اور واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کیے جاتے ہیں۔ مصنف کے کلام پر خوض کیا جاتا ہے اور اُس کے عیب اور خوبیاں صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں۔ اکثر ایک ایک شخص کی لائف کئی کئی ضخیم جلدوں میں لکھی جاتی ہے۔

بیوگرافی اُن بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنھوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں اور جو انسان کی آیندہ نسلوں کے لیے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔ خصوصاً جو قومیں کہ علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزل کے درجہ کو پہنچ جاتی ہیں اُن کے لیے بیوگرافی ایک تازیانہ ہے جو اُن کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ جب وہ اپنے اکابر و اسلاف کی زندگی کے حالات اور اُن کے کمالات دریافت کرتے ہیں تو اُن کی غیرت کی رگ حرکت میں آتی ہے۔ اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال اُن کے دِلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں اکثر لوگ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی کے حالات صرف کتابوں میں پڑھ پڑھ کر اپنے تئیں انسانیت کے اعلیٰ درجہ تک پہنچایا تھا چنانچہ لکھا ہے کہ لوتھر [1] کے دل میں جو ایک غیر معمولی تحریک پیدا ہوئی اور بنجمن [2] فرینکلن نے نہایت پست حالت سے اعلیٰ درجہ تک ترقی اور شہرت حاصل کی اُس کا بڑا سبب یہی بیوگرافی کا مطالعہ تھا۔ بیوگرافی علم اخلاق کی نسبت ایک اعتبار سے زیادہ سودمند ہے۔ کیونکہ علم اخلاق سے صرف نیکی اور بدی کی ماہیت معلوم ہوتی ہے اور بیوگرافی سے اکثر نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی نہایت زبردست تحریک دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور اسلاف کے ستودہ کاموں کی ریس کرنے کا شوق دامن گیر ہوتا ہے۔ انگلستان کے ایک مشہور مصنف کا قول ہے کہ ''بیوگرافی چلا چلا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غل مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو''۔ ہمارے ملک میں بیوگرافی

1۔ لوتھر جرمنی کا رہنے والا عیسائی مذہب کا ایک مشہور مصلح اور تمام یورپ کو پوپ کے پنجے سے نجات دینے والا ہے 1483ء میں پیدا ہوا اور 1546 میں فوت ہوا۔

2۔ یہ شخص امریکا کا ایک مشہور فاضل ہے جس نے سب سے اول علم برق کے اصول دریافت کیے ہیں 1706ء میں بمقام بوسٹن پیدا ہوا اور 1790ء میں فوت ہوا۔

کی طرف اب تک کچھ توجہ نہیں ہوئی۔ ملک کی عام زبان یعنی اُردو میں اب تک یا تو یورپ کے بعض مشہور لوگوں کے حالات انگریزی سے ترجمہ ہوئے ہیں یا ایسے لوگوں کے سوانح لکھے گئے ہیں۔ جن کے حالات پڑھ کر کوئی عمدہ تحریک دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک ہندو مسلمانوں کے اکابر و اسلاف میں بھی ایسے بہت سے افراد نکلیں گے جن کے بڑے بڑے کام اور اُن کے کمالات قوم کے لیے سرمایہ افتخار ہیں اور موجودہ نسلوں کا فرض ہے کہ اُن کا نام زندہ کرنے اور آیندہ نسلوں کا دل بڑھانے کے لیے اُن کے فضائل اور کمالات دنیا میں شایع کریں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ قدما میں جو سب سے زیادہ مشہور ہیں اُن کے بھی مفصل حالات دستیاب ہونے سخت دشوار بلکہ ناممکن ہیں صرف تذکروں میں کچھ کچھ مختصر حال درج ہے لیکن اُس سے کسی کی لائف ترتیب وار لکھنی ہرگز ممکن نہیں۔

ہم نے اس خیال سے کہ شیخ سعدی شیرازی کا نام حد سے زیادہ مشہور ہے شاید اُن کے مفصل حالات بہم پہونچ جائیں۔ اُن کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور اس غرض سے اکثر فارسی تذکرے جو یہاں مل سکتے ہیں دیکھے اور انگریزی تذکرہ سرگور اوسلی [1] صاحب کا بھی دیکھا مگر اِن تمام تذکروں میں زیادہ تر وہی شیخ کی مشہور نقلیں اور حکایتیں جو زبان زد خاص و عام ہیں تھوڑے تفاوت کے ساتھ مندرج پائیں۔ شیخ کی تصنیفات پر بھی اجمالی تعریف کے سوا کسی نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس سے اُس کے کلام کی عظمت اور واقعی خوبیاں معلوم ہوں۔ اگرچہ یہ تمام باتیں مایوس کرنے والی تھیں مگر ہم نے اپنے ارادہ کو جس طرح ہوسکا پورا کیا۔ جس قدر صحیح اور معقول باتیں تذکروں سے معلوم ہوسکتی تھیں اُن کے علاوہ بعض حالات خود شیخ کے کلام سے استنباط کیے۔ اور نیز اُس عہد کی تاریخ میں اکثر واقعات کا سراغ لگایا اور کچھ باتیں علی بن احمد جامع کلیات شیخ کے دیباچہ سے اخذ کیں۔ اور کچھ کچھ انگریزی کتابوں سے بھی مدد لی۔ اور اس تمام معلومات کو جہاں تک ممکن تھا لائف کی

1۔ یہ صاحب 1878ء میں جب کہ مارکوئس آف ولزلی صاحب گورنر جنرل تھے بطریق سیاحت ہندستان میں آئے تھے۔ شدہ شدہ لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں کے ہاں نوکر ہوگئے۔ پھر گورنمنٹ کی طرف سے ایران میں سفیر ہوکر گئے۔ سفارت کے زمانے میں ایک تذکرہ ایران کے مشہور شاعروں کا جن میں شیخ بھی شامل ہے اُنھوں نے بہت کوششوں سے لکھا تھا۔

صورت میں مرتب کیا۔ اور شیخ کی تصنیفات کے بیان میں زیادہ تر اپنی ناچیز رائے اور تفحص پر بھروسا کر کے یہ مضمون ختم کیا گیا۔ اگر چہ شیخ کی اصل سرگزشت میں جس قدر کہ وہ اب تک معلوم ہوئی ہے، کوئی عظیم الشان واقعہ نہیں ہے لیکن جس ترتیب کے ساتھ اُس کے پراگندہ حال جمع کر کے اس کتاب میں لکھے گئے ہیں اور جس طریقہ سے اُس کی عمدہ تصنیفات اور پاکیزہ خیالات پر بحث کی گئی ہے اُس سے اُمید کی جاتی ہے کہ عام ناظرین کے لیے اس کا مطالعہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔ اور خاص کر شعرا کو اس سے کسی قدر بصیرت اور نصیحت بھی حاصل ہوگی۔

اِس کتاب کے دو باب اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلے باب میں شیخ کی سوانح عمری کا بیان ہے اور دوسرے باب میں اُس کی تصنیفات کا مفصل ذکر ہے اور خاتمہ میں اُس کے عام حالات اور عام شاعری پر بالا جمال نظر کی گئی ہے۔ اگر چہ اسلام کے قدیم مصنفوں میں بے شمار لوگ ایسے گزرے ہیں جن کی عظمت اور جلالت کے سامنے شیخ کو کچھ رتبہ نہیں ہے مگر ہم نے سب سے اول شیخ کا حال اس لیے لکھا ہے کہ ہندستان میں اُس سے زیادہ کوئی مسلمان مصنّف مقبول اور مشہور نہیں ہے اور خاص کر فارسی زبان کے شعرا میں میرے نزدیک کوئی شاعر اُس کے رتبہ کو نہیں پہنچا۔ لیکن اگر زمانے نے فرصت دی تو ہمارا ارادہ ہے کہ اور بھی چند مشہور اور ذی وقعت مصنفوں کی سوانح عمری اور اُن کی تصنیفات کا بیان جدا جدا لکھیں گے۔

السّعیُ منّی و الاتمام من الله

پہلا باب

شیخ کی سوانح عمری

شیخ کی سرگزشت بیان کرنے سے پہلے اُس مردم خیز خطہ کا مختصر حال لکھنا شاید بے محل نہ ہوگا جس کی خاک سے ایسا مفید اور مقبول مصنّف پیدا ہوا۔ اور جہاں سے علماء وشعرا اور جلیل القدر مصنفوں کی ایک جماعت کثیر عروج اسلام کے ہر طبقہ اور ہر صدی میں ظہور کرتی رہی ہے۔

فارس اور شیراز کا حال

ایران کے جنوب مغربی حصے میں خلیج فارس کے کنارہ پر پارس [1] ایک خطہ ہے جس کو عرب فارس کہتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں تمام ایران کو پارس کہتے تھے لیکن اب خاص اس حصے کو پارس کہا جاتا ہے۔ اس چھوٹی سی ولایت میں بہت سی قدرتی اور قدیم مصنوعی چیزیں ایسی ہیں کہ اُس کو دنیا کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

تقریباً آدھا ملک پہاڑی اور آدھا میدانی ہے۔ اور جنوبی حد پر سمندر یعنی خلیج فارس ہے آب و ہوا نہایت گرم ہے اور کہیں نہایت سرد ہے۔ اکثر صحرا سرسبز وشاداب ہیں۔ جا بجا چشمے اور ندیاں جاری ہیں۔ صحرائے شاپور میں جو کہ شیراز کے نواح میں ہے ایک وسیع قطعہ ہے جس کا نام شعب بوآن ہے۔ عرب کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں چار تفرج گاہیں ایسی

1۔ پارس جیسا کہ فرہنگ ناصری میں لکھا ہے ہوشنگ کے بیٹے کا نام تھا۔ اُسی کے نام سے قدیم زمانہ میں تمام ایران کو پارس کہتے تھے اور اہلِ یورپ اب بھی تمام ایران کو اسی لیے پرشیا یعنی پارس کہتے ہیں لیکن جب سے کہ ایران کے ہر ایک صوبہ اور ولایت کا جدا جدا نام رکھا گیا اُس وقت سے پارس اِس خاص ولایت کو کہنے لگے۔

ہیں جن کا نظیر نہیں۔ صغد سمر قند [1]، غوطہ دمشق، نہر اُبلہ اور شعب بوآن اتا بک ابو بکر بن سعد زنگی جس کے عہد حکومت میں شیخ نے گلستاں لکھی ہے ہمیشہ فخر سے کہا کرتا تھا کہ میرے ملک میں دو چیزیں ایسی ہیں جو خوف اور اطمینان کی حالت میں بادشاہوں کے لیے ناگزیر ہیں۔ خوف کی حالت میں قلعہ سفید اور اطمینان کی حالت میں نزہت گاہ شعب بوآن۔ اکثر شعرائے عرب نے اِس قطعہ کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں جن میں سے سلامی شاعر کا قصیدہ جو عضد الدولہ دیلمی کی فرمائش سے لکھا گیا تھا بہت مشہور ہے۔ ایک اور شاعر کہتا ہے۔

اذا اشرف المحزون من راس قلعة　　　علی شعب بوّان استراح من الکرب

ترجمہ: جب غمگین آدمی قلعہ پر سے شعب بوآن کی فضا کو دیکھتا ہے تو اُس کی تمام کلفتیں دور ہو جاتی ہیں۔

فارس کے میوے عراق عجم میں جاتے ہیں۔ گرم پانی کے چشمے اور سفید کانیں فارس میں موجود ہیں۔ فارس کے آثار قدیمہ دنیا کے اُن عجائبات میں سے ہیں جن کو اگلے زمانہ کے لوگ جن اور پری کے کام سمجھتے تھے۔ جیسے تخت جمشید، نقش شاپور، دحمہ فریدون اور خانہ زردشت ان کا مفصل حال ایران کی انگریزی تاریخوں میں مذکور ہے۔ انہی آثارِ قدیمہ کی نسبت عرفی شیرازی نے کہا ہے:

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ　　　آثار پدیداست صنادید عجم را

اِس کے سوا اور بہت سی خصوصیتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے انسان کے قویٰ میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فارس کے اکثر شہر مردم خیز سمجھے گئے ہیں۔ جیسے یزد بند، گازرون، فیروز آباد، بیضا، شیراز وغیرہ۔ اِن شہروں میں کثرت سے علماء و فضلا اور ادیب و شاعر پیدا ہوئے ہیں جن کی تصنیفات مسلمانوں میں اب تک موجود ہیں۔ خصوصاً شیراز جو کہ صدہا سال ایران کا پائے تخت رہا ہے۔ مسلمان ایرانیوں نے جس طرح قم کو دار المومنین اور یزد کو دار العباد کا خطاب دیا ہے اسی طرح شیراز کو دار العلم کے لقب سے ملقب

1۔ صغد معرب صغد و نشب کی زمین اور صغد سمر قند ایک نزہت گاہ سمندر کے قریب تھی۔ غوطہ بھی نشیب کی زمین کو کہتے ہیں۔ اور غوطہ دمشق کی ایک سیر گاہ دمشق میں تھی۔ اُبلہ بصرہ میں ایک پُر فضا مقام تھا وہاں ایک ندی تھی اُس کو نہر ابلہ کہتے تھے۔ یہ تینوں مقام اور شعب بوان دنیا کے چار بہشت سمجھے جاتے تھے۔

کیا ہے۔ اگرچہ شیراز کا علم وفضل زمانہ کے انقلاب اور سلطنت اسلامیہ کے تنزل سے اب نہایت پست حالت میں ہے لیکن اُس کی موجودہ نسلوں کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قدیم بزرگی اور برتری کے نشہ میں اب تک بدمست ہیں۔ حاجی لطف علی خان آذر نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ شیراز کے چھوٹے بڑے جوان اور بوڑھے صحبت اور جلسوں پر فریفتہ ہیں۔ کسبِ معاش اس قدر کرتے ہیں کہ کسی کے محتاج نہ ہوں۔ تھوڑی سی آمدنی پر قانع رہتے ہیں۔ ہمیشہ سیر گاہوں اور قہوہ خانوں میں جمع ہوتے ہیں۔

شیراز کی بنیاد اسلام کے زمانہ میں پڑی ہے محمد بن قاسم جس نے مسلمانوں میں سب سے اوّل ہندستان پر لشکر کشی کی ہے شیراز کا بانی ہے یہ شہر پہلی صدی ہجری کے اخیر میں ایک نہایت سرسبز شاداب قطعہ زمین پر آباد کیا گیا ہے۔ تقویم البلدان میں لکھا ہے کہ ''شیراز کے مکانات بہت وسیع اور بازار پُر رونق ہیں اور گھر گھر نہر جاری ہے۔ شاید ہی کوئی مکان ایسا ہو جس میں ایک عمدہ باغ اور نہر نہ ہو'' پھر صفاریوں [1] اور دیلمیوں [2] کے عہد میں شیراز نے اور بھی زیادہ وسعت اور رونق حاصل کی۔ عضد الدولہ دیلمی کے زمانہ میں اُس کی آبادی اس درجہ کو پہنچی کہ شہر میں اہلِ لشکر کی گنجایش نہ رہی اور شہر کے باہر ایک جدید عمارت بنائی گئی جس کا نام سوق الامیر رکھا گیا اور اُس کے بیٹے صمصام الدولہ نے اس جدید عمارت کے گرد پختہ فصیل کھنچوائی۔

شیراز کی آب وہوا نہ زیادہ گرم ہے نہ زیادہ سرد بلکہ نہایت معتدل اور خوشگوار ہے۔ شیخ سعدی اور خواجہ حافظ اور اکثر پُرانے اور نئے شاعروں نے شیراز کی تعریف میں اشعار اور قصیدے لکھے ہیں از اں جملہ خواجہ حافظ کا یہ شعر مشہور ہے:

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت کنارِ آبِ رکنا باد گلگشتِ مصلیٰ را

شیخ علی حزیں نے بارھویں صدی ہجری میں جب کہ شیراز کی رونق بالکل جا چکی تھی اُس کو دیکھا ہے وہ اپنے سوانح عمری میں اُس کی بہت سی تعریف کے بعد لکھتا ہے کہ ''شیراز کی آب وہوا دماغ کے ساتھ نہایت مناسبت رکھتی ہے جس قدر رچا ہو کتاب کے مطالعہ اور فکر وغور

1۔ صفاریوں میں تین بادشاہ ہوئے چالیس برس اُن کی سلطنت رہی۔

2۔ دیلمیوں میں اٹھارہ بادشاہ ہوئے جن کی حکومت 248 برس رہی۔

مضامین میں مصروف رہو کبھی جی نہ اُکتائے گا"۔

اس میں شک نہیں کہ شہر کا قدرتی موقع اور آب و ہوا کی خوبی اور عمارت کی لطافت و خوش اسلوبی باشندوں کے خیالات اور قویٰ پر عجیب اثر رکھتی ہے یہی سبب ہے کہ شیراز کے اکثر مشائخ اور علماء و شعرا پاکیزہ طبع اور لطیف و ظریف ہوئے ہیں شیخ نے بوستاں کے دیباچے میں اہلِ شیراز کو اُن تمام اشخاص پر ترجیح دی ہے جن سے وہ حالت سفر میں ملا تھا شیراز سے جس قدر علماء و مشائخ و شعرا و مصنفین ابتدا سے اخیر تک اُٹھے ہیں اور جن کا حال مسلمانوں کے تذکروں میں جابجا مذکور ہے اُن کی تعداد سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اِس شہر کی خاک علم و ہنر کے ساتھ کس قدر مناسبت رکھتی ہے اور شیخ کے کلام کی بے نظیر شہرت اور مقبولیت سے ثابت ہے کہ شیخ کا وجود بھی شیراز کے لیے کچھ کم باعثِ افتخار نہ تھا۔

شیخ کا نام، نسب، ولادت اور بچپن

اُس کا نام شرف الدین اور مصلح لقب اور سعدی تخلص ہے سرگور اوسلی نے اُس کی ولادت [1] 589 ہجری مطابق 1333ء میں لکھی ہے مگر تحقیق یہ ہے کہ وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتابک مظفر الدین تکلہ بن زنگی کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ بن زنگی [2] کی جگہ تختِ شیراز پر متمکن ہوا تھا۔ چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اور نیز شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا اس لیے اُس نے اپنا تخلص سعدی قرار دیا۔ شیخ کا باپ جیسا کہ

1۔ اُس کی ولادت کا سال کسی نے نہیں لکھا صرف سالِ وفات سب نے لکھا ہے یعنی 691 ہجری اور اُس کی عمر 102 یا 110 یا 120 برس کی بتائی ہے پس کم سے کم عمر ماننے سے اُس کی ولادت 589 ہجری میں قرار پاتی ہے لیکن اس سے لازم آتا ہے کہ ابوالفرج ابن جوزی جو بغداد میں اُس کا جلیل القدر اُستاد تھا اُس کی وفات کے وقت جو کہ قطعاً 597 ہجری میں ہوئی ہے شیخ کی عمر نو برس سے زیادہ نہ ہو اور یہ بالکل خلاف واقع ہے اس لیے اُس کی عمر 102 برس سے زیادہ تسلیم کرنی چاہیے۔

2۔ بوستان میں تکلہ کو شاہانِ پیشین میں لکھا ہے حالانکہ سعدی اُس کے وقت میں پیدا ہو لیا تھا اِس کا سبب یہ ہے کہ بوستان تکلہ سے چوتھے بادشاہ یعنی ابوبکر کے عہد میں لکھی گئی ہے پس شاہانِ پیشین سے وہ بادشاہ مراد ہیں جو ابوبکر سے پہلے تھے نہ وہ جو سعدی سے پہلے تھے۔

اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے ایک باخدا اور متورّع آدمی تھا۔ شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں کہ نماز روزہ کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے اور بچپن ہی میں اُس کو عبادت، شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔ عید اور تہواروں میں ہمیشہ باب کے ہمراہ رہتا تھا اور کہیں آوارہ پھرنے نہ پاتا تھا۔ باپ اُس کے افعال و اقوال کی نگرانی عام باپوں کی نسبت بہت زیادہ کرتا تھا اور بے موقع بولنے پر زجر و توبیخ کرتا تھا۔ شیخ نے اپنی تربیت کا بڑا سبب اسی باپ کی تادیب اور زجر و توبیخ کو قرار دیا ہے چنانچہ وہ بوستان میں کہتا ہے:

ندانی کہ سعد مکان از چہ یافت　　　نہ ہامون نوشت و نہ دریا شگافت
بخوردی بخورد از بزرگان قفا　　　خدا دادش اندر بزرگی صفا

لیکن شیخ کے بعض اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ اُس کو کم سن چھوڑ کر مر گیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد غالبًا شیخ کی والدہ نے اُس کو تربیت کیا ہوگا کیونکہ اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کی حالت میں اُس کی ماں زندہ تھی۔ کئی تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ علامہ قطب الدین شیرازی جو کہ محقق طوسی کا شاگردِ رشید اور ہولاکو خان کا مصاحب خاص تھا شیخ کا ماموں یا قریب کا رشتہ دار تھا مگر بعض تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اور علامہ کے باہم ایسی بے تکلفانہ ہنسی اور چہل ہوتی تھی جو ماموں بھانجوں میں نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال شیخ اور علامہ دونوں ہمعصر تھے اور شاید کچھ قرابت بھی رکھتے ہوں۔

شیخ کی تعلیم کا حال

اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش مزاج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زہد و عبادت اور صلاح و تقویٰ کی زیادہ ترغیب دی گئی تھی۔ اس کے سوا شیخ ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔ مگر اُس نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اُس کے قرب و جوار میں علماء اور مشائخ اور فصحا و بلغا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور اُن سے بھی زیادہ ایک جم غفیر کا شہرہ جو خطہء فارس میں اہل کمال ہوگزرے تھے بزرگوں

سے سنا تھا۔ قاعدہ ہے بزرگوں اور کاملوں کے دیکھنے یا اُن کی شہرت اور ذکر خیر سننے سے ہونہار لڑکوں کے دل میں خود بخود اُن کی ریس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے تحصیلِ علم کا شوق اُس کو دامنگیر ہوا۔ اگر چہ دارالعلم شیراز میں تحصیل علم کا سامان مہیا تھا۔ علمائے جلیل القدر درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ مدرسہ عضدیہ جو کہ عضدالدولہ دیلمی نے قایم کیا تھا اور اُس کے سوا اور مدرسے وہاں موجود تھے لیکن اُس وقت ایسی ابتری اور خرابی پھیلی ہوئی تھی کہ اہلِ شیراز کو ایک دم اطمینان نصیب نہ تھا۔ اگر چہ اتابک سعد بن زنگی نہایت عادل، رحم دل بامروت اور فیاض بادشاہ تھا مگر اُس کی طبیعت میں اولوالعزمی حد سے زیادہ تھی۔ اکثر شیراز کو خالی چھوڑ کر عراق کی حدود میں لشکر کشی کرتا رہتا تھا۔ اور اپنی مہمات کے شوق میں ممالک محروسہ کو بالکل فراموش کر دیتا تھا۔ اُس کی غیبت کے زمانہ میں اکثر مفسد لوگ میدان خالی پا کر اطراف و جوانب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے اور قتل و غارت کر کے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ ساتویں صدی کے آغاز میں اول اتابک اوزبک پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سلطان غیاث الدین نے بہت سے لشکر کے ساتھ آ کر شیراز کو ایسا تاخت و تاراج کیا کہ اُس کی تباہی اور بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا ایسی حالت میں تحصیلِ علم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار بلکہ ناممکن تھی۔ اِس کے علاوہ امن کے زمانہ میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیلِ علم میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ یہ اسباب تھے جنھوں نے شیخ کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار میں اُس نے شیراز سے تنگ آ کر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے:

دلم از صحبت شیراز بکلّی بگرفت — وقت آنست کہ پرسی خبر از بغدادم
سعدیا حبّ وطن گرچہ حدیثیست صحیح — نتواں مُرد بسختی کہ من اینجا زادم

ترجمہ: میرا دل شیراز کی صحبت سے تنگ آ گیا۔ اب وہ وقت ہے کہ مجھ سے بغداد کا حال پوچھو۔ اے سعدی وطن کی محبت اگر چہ صحیح بات ہے۔ مگر اس ضرورت سے کہ میں یہاں پیدا ہوں سختی سے مرا نہیں جاتا۔

اُس زمانہ میں مسلمانوں کے بے شمار مدرسے بلادِ اسلام میں جابجا کھلے ہوئے تھے

جہاں دور دور سے طالب علم آ آ کر علم تحصیل کرتے تھے۔ ہرات، نیشاپور، اصفہان، بصرہ اور بغداد میں خواجہ نظام الملک طوسی وزیر الپ ارسلان کے بنائے ہوئے مدرسے آباد اور معمور تھے اِن کے سوا شام [1]، عراق اور مصر وغیرہ جگہ جگہ مدرسے جاری تھے لیکن سب سے زیادہ شہرت نظامیہٗ بغداد نے حاصل کی تھی جس کو خواجہ نظام الملک طوسی نے 459 ہجری میں بنوایا تھا ہزاروں جلیل القدر عالم اور حکیم اِس مدرسہ سے تعلیم پا کر نکلے ہیں جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں موجود ہیں۔ یہ مدرسہ اس قدر نامور تھا کہ جو علماء یہاں کے پڑھے ہوئے مشہور ہو جاتے تھے پھر اُن کے مستند اور ذی اعتبار ہونے میں کسی کو شبہ نہ رہتا تھا۔ امام ابو حامد غز آلی، شیخ عراق عبد القاہر سہروردی، استاد الائمہ ابو حامد عماد الدین موصلی اور بڑے بڑے جلیل القدر عالموں نے اسی مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ شیخ کو اس مدرسہ میں آنے کی ترغیب اس سبب سے اور بھی زیادہ ہوئی ہوگی کہ اُس کا ہم وطن شیخ ابو اسحاق شیرازی جس کا علم و فضل شہرۂ آفاق تھا مدت تک اِس مدرسہ کا متولی رہا تھا۔ جس وقت نظام الملک نے بغداد میں یہ مدرسہ قایم کیا تھا تو سب سے اول یہاں کا متولی شیخ ابو اسحاق کو مقرر کیا تھا اور اِس سبب سے اہلِ شیراز کو اِس مدرسہ سے ایک خاص نسبت اور لگاؤ تھا۔

الغرض شیخ نے مدرسہ نظامیہ میں جا کر تحصیل علم شروع کی اور جیسا کہ بوستان میں اُس نے تصریح کی ہے وہاں سے اُس کے لیے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا۔ بغداد میں جن لوگوں سے شیخ نے پڑھا تھا اُن میں سب سے زیادہ مشہور اور نامور شخص علامہ ابوالفرج عبد الرحمٰن ابن جوزی ہے جس کا لقب جمال الدین ہے۔ یہ شخص حدیث اور تفسیر میں اپنے وقت کا امام تھا۔ بے شمار کتابیں اِس کی تصنیفات سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُس نے مرتے وقت وصیّت کی تھی کہ میں نے جن قلموں سے حدیث لکھی ہے اُن کا تراشہ میرے حجرے میں ہے۔ مرنے

1۔ اِن میں سے مدرسہ ناصریہ ملک الناصر صلاح الدین کا بنایا ہوا قبرس میں اور مدرسہ رواحیہ رواحہ کے پوتے زکی ابوالقاسم ہبۃ اللہ کا۔ اور نیز مدرسۃ الشام خاتون بنت ایوب خواہر صلاح الدین کا اور دار الحدیث ملک عادل بن ایوب کا دمشق میں اور مستنصریہ خلیفہ مستنصر باللہ کا بغداد میں اور صاحبیہ وزیر صفی الدین کا قاہرہ میں اور نوریہ نور الدین ارسلان شاہ صاحب موصل کا موصل میں بہت مشہور تھے۔ ان کے سوا جیسا کہ تاریخ ابن خلکان سے معلوم ہوتا ہے اور بہت سے مدرسے جیسا مدرسہ ثقفیہ، قاہریہ، عزیزیہ، عزیہ، زنجیہ، نفیسیہ، علائیہ وغیرہ وغیرہ بیت المقدس، موصل، بغداد، دمشق اور اسکندریہ وغیرہ میں موجود تھے۔

کے بعد جب مجھ کو نہلائیں تو غسل کے لیے اُس تراشہ سے پانی گرم کریں۔ چنانچہ اس کی وصیت کے مطابق عمل کیا گیا۔ اور پانی گرم ہو کر کچھ تراشہ بچ رہا۔

جس زمانہ میں شیخ بغداد میں علامہ ابن جوزی سے پڑھتا تھا اُس وقت شیخ کی جوانی کا آغاز تھا۔ دولت شاہ سمرقندی اور سرگوراوسلی نے لکھا ہے کہ ابن جوزی سے تحصیل علم کرنے کے بعد شیخ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بیعت کی تھی اور اُن سے علم تصوف اور طریق معرفت وسلوک حاصل کیا۔ اور پہلی مرتبہ انھیں کے ساتھ بیت اللہ کے حج کو گیا۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ کیونکہ شیخ سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی وفات 561 ہجری میں یعنی شیخ سعدی کی ولادت سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ البتہ اِس میں شک نہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی سے اُس کو صحبت رہی ہے اور ایک بار سفر دریا میں وہ اُن کے ساتھ رہا ہے۔

شیخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں اُس کے ہم عمر اور ہمسر لوگ اُس کی خوش بیانی اور حُسن تقریر پر رشک کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار اُس نے اُستاد سے شکایت کی کہ فلاں طالب علم مجھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے جب میں آپس میں بیٹھ کر مسائلِ علمیہ بیان کرتا ہوں تو وہ حسد سے جل جاتا ہے اُستاد یہ سن کر شیخ پر غصّے ہوا اور یہ کہا کہ اوروں کے رشک وحسد کی تو شکایت کرتے ہو اور اپنی بدگوئی اور غیبت کو بُرا نہیں سمجھتے۔ تم دونوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو وہ رشک وحسد سے اور تم بدگوئی وغیبت سے۔

شیخ کو بچپن سے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے فقر اور درویشی کی طرف زیادہ میلان تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں بھی وہ برابر وجد وسماع کی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ اور علامہ ابوالفرج ابن جوزی ہمیشہ اُس کو سماع سے منع کرتا تھا مگر شیخ کو سماع کا ایسا چسکا تھا کہ اِس باب میں کسی کی نصیحت کارگر نہ ہوتی تھی۔ لیکن علماء کی سوسائیٹی آہستہ آہستہ اُس کے دل میں گھر کرتی جاتی تھی۔ آخر ایک روز کسی مجلس میں اُس کو ایک بدآواز قوال سے پالا پڑا اور بضرورت ساری رات اُس مکروہ صحبت میں بسر ہوئی۔ صحبت کے ختم ہونے پر آپ نے سر سے منڈاسا اُتارا اور جیب میں سے ایک دینار نکالا اور یہ دونوں چیزیں قوال کی نذر کیں۔ اصحابِ مجلس کو اِس حرکت سے تعجب ہوا۔ شیخ نے یاروں سے کہا کہ میں نے آج اِس شخص کی کرامت مشاہدہ کی ہے۔ میرا مربی اُستاد ہمیشہ سماع سے منع کرتا تھا مگر میں نے اُس کے حکم

کی تعمیل نہ کی اور برابر سماع میں شریک ہوتا رہا۔ آج خوش قسمتی سے اس مبارک جلسے میں آنا ہوااور اِس بزرگوار قوال کے تصرف سے میں نے ہمیشہ کے لیے سماع سے توبہ کی۔

شیخ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی صحبت سے عالم طالب علمی ہی میں تصوف اور درویشی کے خیالات اُس کے دل سے اُتر گئے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک شخص خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسہ میں چلا آیا۔ میں نے پوچھا کہ عالم اور درویش میں کیا فرق دیکھا جو اُس طریقہ کو چھوڑ کر اِس کوچہ میں قدم رکھا۔ کہا درویش صرف اپنی جان بچانے میں کوشش کرتے ہیں اور علماء یہ چاہتے ہیں کہ اپنے ساتھ ڈوبتوں کو بھی بچائیں۔

شیخ نے شعر میں اکثر یہ بات جتائی ہے کہ اُس کو کسی سرزمین کے ساتھ عراق یا بغداد سے بڑھ کر تعلق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے:

بعداز عراق جائے خوش ندیدم ہوائے　　　ساقی بزن نوائے زان پردۂ عراقی

جس زمانہ میں شیخ نظامیہ بغداد میں پڑھتا تھا اگرچہ اُس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر ظاہری شان وشوکت ہارون اور مامون کے عہد کو یاد دلاتی تھی۔ عباسیہ کا اخیر خلیفہ مستعصم باللہ سریر سلطنت پر متمکن تھا۔ اور اُس کے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چندروز کے لیے سنبھالا لیا تھا۔ اطراف عالم کے اکابرواشراف اور ہر علم وفن کے ماہراور ارباب حرفت وصنعت مدینۃ السلام بغداد میں جمع تھے عیش وعشرت کے سامان حد سے زیادہ ہر طرف مہیا نظر آتے تھے۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب وداب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے۔ اور بڑے بڑے شہریار اور فرماں روا بارگاہ خلافت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے۔ قصرِ خلافت کے آستانے پر ایک پتھر بمنزلہ حجرالاسود کے پڑا ہوا تھا۔ جس کو امرااور اعیان سلطنت قصر خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسا دیتے تھے تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی وہاں ایک مدت پہلے سے رستہ کے تمام منظر اور بالاخانے کرایہ داروں سے رُک جاتے تھے۔ الغرض عباسیہ کا یہ آخری جاہ وجلال شیخ نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اور پھر اُسی آنکھ سے اُس دارالخلافہ کا بے چراغ ہونا جو چھ سو برس بوسہ گاہِ ملوک وسلاطین رہا تھا اور اِس خاندان کی بربادی جس کا سایۂ اقتدار یورپ، ایشیا اور افریقہ پر برابر پڑتا تھا اور خلیفہ اور اُس کی اولاد اور ہزارہا بنی عباس اور کئی لاکھ اہلِ لشکر اور اہلِ بغداد کا

تا تاریوں کی تیغ بے دریغ سے قتل ہونا اور عرب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لیے صفحۂ روزگار سے مٹ جانا مشاہدہ کیا تھا۔ شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستعصم باللہ کی تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوئے اور وہ ظلم و ستم بھی اُس کی آنکھوں کے روبرو گزرے تھے جو ہلاکو خان کے خونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کیے اِن حوادث و واقعات کا تماشا شیخ کے لیے ایک نہایت عمدہ سبق تھا جس نے اُس کے دل میں قوم کی دلسوزی بادشاہوں کی اصلاح رعایا کی ہمدردی اور ہر طبقہ کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اُسی خیال کی بدولت اُس نے اپنی تمام عمر ابنائے جنس کی نصیحت اور خیر اندیشی میں صرف کی۔ مستعصم باللہ کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ نے اُس وقت لکھا ہے جب کوئی شخص اُس کا رونے والا اور خود اسلام کے سوا کوئی اُس کا ماتم دار اور سوگوار دنیا میں باقی نہ تھا۔ اِس مرثیہ کی چند ابیات اس موقع پر نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

ابیات

اشعار	ترجمہ
1 آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین برزوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین	1 آسمان کا فرض ہے کہ مستعصم کی تباہی پر زمین پر خون برسائے۔
2 ای محمدؐ گر قیامت می برآری سر زخاک سر برآور دین قیامت درمیانِ خلق بین	2 اے محمد صلعم اگر آپ قیامت ہی کو مرقد سے باہر نکلیں گے تو ابھی نکل کر قیامت دنیا میں دیکھ لیجیے۔
3 نازنینانِ حرم را خون حلق نازنین زآستان بگذشت و ماراخون دل از آستین	3 محل کے نازپروردوں کے حلق کا خون ڈیوڑھی سے بہہ گیا اور ہمارے دل کا خون آستین سے ٹپک نکلا۔
4 زینہار از دورِ گیتی و انقلابِ روزگار در خیال کس نہ گشتی کانچنان گردد چنین	4 زمانہ کی گردش اور دنیا کے انقلاب سے پناہ مانگنی چاہیے یہ بات کسی کے خیال میں بھی نہ آتی تھی کہ یوں سے یوں ہو جائے گا۔

5 دیدہ بردارا یکہ دیدی شوکتِ بیت الحرام
قیصرانِ روم سر برخاک و خاقان بر زمین

5 جنھوں نے اُس بیت الحرام کی شان وشوکت دیکھی ہے جہاں روم کے قیصر اور چین کے خاقان خاک پر سر رگڑتے اور زمین پر بیٹھتے تھے وہ ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھیں۔

6 خون فرزنداں عم مصطفیٰ شد ریختہ
ہم برآن خاکی کہ سلطانان نہادندے جبین

6 کہ پیغمبر خدا کے بنی عم کا خون اُس خاک پر بہہ گیا جہاں سلاطین ماتھا رگڑتے تھے۔

7 بعد ازین آسایش از دنیا نباید چشم داشت
قیر در انگشتری ماند چو برخیزد نگین

7 آیندہ دنیا سے آرام کی توقع رکھنی نہیں چاہیے کیونکہ انگوٹھی پر سے جب نگیں جاتا رہتا ہے تو نری کلونس رہ جاتی ہے۔

8 دجلہ خونابست زین پس گر نہد سر در نشیب
خاک نخلستان بطحا را کند باخون عجین

8 دجلہ کا پانی نکتر لہو ہوگیا ہے اگر اب جاری رہے گا تو نخلستان بطحا کی خاک کو خون سے رنگین کر دے گا۔

9 نوحہ لائق نیست برخاک شہیدان زانکہ ہست
کمترین دولت مر ایشانرا بہشت برترین

9 شہیدوں کی خاک پر نوحہ کی کیا ضرورت ہے کیونکہ اُن کے لیے ادنیٰ نعمت فردوس بریں ہے۔

10 لیکن از روے مسلمانی و راہ مرحمت
مہربان را دل بسوزد در فراق نازنین

10 ہاں مگر رحم اور اسلام کی ہمدردی کے سبب دوست کا دل دوست کی جدائی میں کُڑھتا ہے۔

11 باش تا فردا کہ بینی روزداو و رستخیز
کز لحد بار وے خون آلودہ برخیزد دفین

11 کل تک صبر کرو قیامت کے دن دیکھ لینا کہ قبر سے اہل قبر لہو بھرا منھ لے کر اُٹھیں گے۔

12 تکیہ بر دنیا نباید کرد دل بروی نہاد کاسمان گاہے بمہراست ای برادر گہ بکین	12 یارو دنیا پر بھروسا کرنا اور اُس سے دل لگانا نہیں چاہیے کیونکہ آسمان کبھی دوست ہے اور کبھی دشمن۔
13 زور بازوی شجاعت بر نیاید با اجل چون قضا آید نماند قوت رای رزین	13 شجاعت کا زور موت پر غالب نہیں آسکتا اور جب قضا آتی ہے تو رائے صائب کی قوت جاتی رہتی ہے۔
14 تیغ ہندی بر نیاید روز ہیجا از نیام شیر مردیرا کہ باشد مرگ پنہان در کمین	14 جس بہادر کی گھات میں اجل ہوتی ہے اس کی اصیل تلوار لڑائی کے دن میان سے باہر نہیں نکلتی۔
15 تجربت بیفائدہ است آنرا کہ برگردید بخت حملہ آوردن چہ سود آنرا کہ برگردید زین	15 جب نصیبہ پلٹ گیا پھر اُس کا امتحان کرنا بے فائدہ ہے اور جب زین اُلٹ گیا پھر حملہ کرنا فضول ہے۔
16 کرگسانند ازپے مردار دنیا جنگجو ای برادر گرخردمندی چو سیمرغان نشین	16 یارو مردار دنیا کے لیے گِدھ آپس میں لڑ رہے ہیں اگر تم عقلمند ہو تو سیمرغوں کی طرح الگ بیٹھو۔

شیخ پر بعض امامیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مستعصم باللہ جیسے نالائق اور ناشدنی خلیفہ کا مرثیہ لکھنا شیخ کی شان سے نہایت بعید تھا۔ اگر چہ اس بات کا انکار نہیں ہوسکتا کہ مستعصم باللہ میں دانائی، نیکی اور انصاف بالکل نہ تھا۔ تکبر اور غرور نے اُس کے دماغ کو مختل کر دیا تھا۔ غفلت اور بے پروائی کی نوبت یہاں تک پہونچی تھی کہ ایک بار اُس کے بیٹے ابوبکر نے اہل سنت کی حمایت اور طرفداری میں کرخ کے بنی ہاشم پر نہایت سخت ظلم اور تعدی کی جس کے بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں مگر اُس نالائق خلیفہ نے اِس کا کچھ تدارک نہ کیا۔ لیکن اس سے شیخ کے مرثیہ لکھنے پر کچھ اعتراض نہیں ہوسکتا۔ مستعصم باللہ کو کیسا ہی نالائق اور قابل نفریں سمجھو۔ مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اُس کے بگڑنے سے نہ صرف بنی عباس کی حکومت دنیا سے اُٹھ گئی بلکہ مشرق سے مغرب تک جہاں جہاں عرب کے قدم جمے ہوئے تھے ایکبارگی

اُن میں تزلزل آ گیا اور چند روز میں اُن کا اقتدار صفحۂ ہستی سے یک قلم محو ہو گیا۔ پس جس شخص کے رگ و پے میں عرب کے خون کا ایک قطرہ بھی ملا ہوا تھا یا جس کے دل میں ایک ذرہ برابر اسلام کی حمیت تھی اُس کے لیے اِس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو سکتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنی عم کا خون تاتاری وحشیوں کے ہاتھ سے آبِ باراں کی طرح بہایا گیا اور جس عمارت کی بنیاد خلفائے راشدین کے ہنر مند ہاتھوں نے ڈالی تھی وہ چشم زدن میں ایک خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ شیخ نے حقیقت میں مستعصم باللہ کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ہے۔ اور اگر اس موقع پر حسان بن ثابتؓ موجود ہوتے تو اُن کو بھی ایسا ہی مرثیہ لکھنا پڑتا۔ مستعصم کے حال پر یہ شعر صادق آتا ہے:

ہمارے بعد بہت روئے ہم کو اہلِ وفا　　　کہ اپنے مٹنے سے مہر و وفا کا نام مٹا

القصہ شیخ مدرسہ نظامیہ سے نکل کر مدت دراز تک ایشیا اور افریقہ میں برابر سیر و سیاحت کرتا رہا جب کتاب کے مطالعہ سے اُس کا جی سیر ہو گیا تو نسخۂ کائنات کا مطالعہ شروع کیا۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ اُس نے تیس برس کی عمر تک تحصیل علم کی ہے اور تیس برس سیر و سفر میں اور تیس برس تصنیف و تالیف میں اور تیس برس عزلت نشینی میں بسر کیے ہیں۔ اگرچہ تیس تیس برس کے چار مساوی حصے مقرر کرنے تکلف سے خالی نہیں۔ اور غالباً یہ مضمون منوشاستر سے اخذ کیا گیا ہے جس میں عمر کو ایسے ایسے تین یا چار حصوں پر تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ شیخ کی عمر کا بڑا حصہ تحصیل علم اور سیر و سفر میں بسر ہوا۔ نفحات الانس میں لکھا ہے کہ شیخ عالم صوفیوں میں سے تھا اور علوم و آداب سے بہرۂ کامل رکھتا تھا۔ اگرچہ اُس کی شہرت طبقہ علماء میں اس قدر نہیں ہوئی جس قدر زمرۂ شعرا میں ہوئی مگر اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک محقق اور سُلجھا ہوا عالم تھا۔ بعض موقعوں پر فقہا اور قضاۃ کے مجمعوں میں اُس کو بحث اور مناظرہ کا اتفاق ہوا ہے اور اخیر کو اُس کی رائے سب پر غالب رہی ہے۔ ایک بار غالباً شام یا عراق کے کسی شہر میں جہاں اُس کے جان پہچان کم تھے کسی تقریب سے قاضی شہر کی مجلس میں اُس کا گزر ہوا۔ اُس وقت شیخ نہایت شکستہ حال تھا اور مجلس میں تمام علماء و فقہاء کمال تزک و احتشام سے بیٹھے تھے۔ شیخ سادگی سے سب کے برابر جا بیٹھا۔ خدام نے جھڑک کر وہاں سے اُٹھا دیا اور مشکل سے پائیں مجلس میں جگہ ملی۔ اُس وقت

کسی مسئلہ میں گفتگو ہو رہی تھی اور کسی سے وہ عقدہ حل نہ ہوتا تھا۔ شیخ نے دور ہی سے بآواز بلند کہا کہ اگر مجھ کو اجازت ہو تو اس باب میں میں بھی کچھ کہوں۔ سب شیخ کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک کم حیثیت آدمی کی ایسی جرأت پر سب کو تعجب ہوا۔ شیخ نے اس مسئلہ کو بہت خوبی اور فصاحت سے بیان کیا۔ چاروں طرف سے تحسین و آفرین ہونے لگی قاضی نے مسند چھوڑ دی اور عمامہ سر سے اُتار کر شیخ کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ نے کہا یہ غرور کا اوزار مجھے نہیں چاہیے۔ جب لوگ مجھ کو حقیر اور ذلیل معلوم ہوں گے تو پھٹے پُرانے کپڑے والوں سے میں بھی تمھاری طرح ناک چڑھاؤں گا۔ اسی طرح اور بہت سے طعن اور ملامت کے الفاظ کہہ کہ وہاں سے چل دیا۔ شیخ نے یہ اپنی سرگزشت بوستان میں اس طرح بیان کی ہے کہ گویا کسی غیر شخص کی سرگزشت ہے مگر اخیر کے شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے خاص اپنی روداد لکھی ہے۔

شیخ کی تحصیل اور مبلغ علم کا حال دریافت ہونا مشکل ہے مگر ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے فلسفہ اور حکمت کی طرف بہت کم توجہ کی تھی۔ زیادہ تر اُس کی ہمت دینیات اور علم سلوک و علم ادب کی جانب مصروف رہی اور خاص کر وعظ اور خطابت میں جس کی تعلیم مدرسہ نظامیہ میں باقاعدہ طور سے ہوتی تھی اُس کو عمدہ دستگاہ تھی۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اُس کے ہم جماعت لوگ اُس کی خوش بیانی پر رشک کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلاد شام میں اُس نے مدتوں وعظ کہا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں ایک دفعہ جامع بعلبک میں وعظ کہہ رہا تھا اور اہلِ مجلس نہایت افسردہ دل تھے جن کو کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ میں اِس آیت کے معنی بیان کر رہا تھا **نحن اقرب إليه من حبل الوريد** کہ ایک راہرو وہاں سے گزرا۔ اُس نے میرا بیان سن کر ایسا پُر جوش نعرہ مارا کہ اور لوگ بھی اس کے ساتھ چیت گئے اور تمام مجلس گرم ہو گئی۔

شیخ کو علاوہ علم و فضل کے اکثر زبانوں سے واقفیت تھی۔ عرب، شام اور مصر وغیرہ میں رہتے رہتے وہاں کی زبان گویا اُس کی مادری زبان ہو گئی تھی۔ وعظ اور بحث و مباحثہ اور تمام معاملات عربی زبان میں کرتا تھا۔ اور صرف روزمرہ کی بول چال ہی پر قدرت نہ تھی بلکہ عربی قصائد فصیح اور بامزہ اُس کے کلیات میں موجود ہیں۔ اِس کے سوا بت خانۂ سومنات کے قصہ میں اُس نے ایک جگہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ژند کی زبان جانتا تھا۔ سرگوراوسلی لکھتے ہیں کہ ایشیاٹک

جنرل کے ایک پرچہ مطبوعہ 1843ء میں فرانس کے مشہور محقق ام گارسن ڈی ٹیسی نے لکھا ہے کہ ''سعدی پہلا شخص ہے جس نے ہندستانی زبان یعنی ریختہ میں جب کہ وہ سومنات اور گجرات میں آیا تھا شعر کہا ہے'' مگر یہ ایک مغالطہ ہے جو نہ صرف محقق مذکور کو بلکہ اس سے پہلے ہندستان کے تذکرہ نویسوں کو بھی ہوا ہے اصل یہ ہے کہ دکن میں بھی ایک شاعر سعدی تخلص اس زمانہ میں ہوا ہے جب کہ ریختہ کی بنیاد پڑنی شروع ہوئی تھی۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ اس کی وفات کو تقریباً چارسو برس گزرے ہیں کہتے ہیں کہ ریختہ میں سب سے پہلے اُس نے شعر کہا ہے اور یہ تین شعر اُس کے مشہور ہیں۔

اشعار

قشقہ چو دیدم بررخش گفتم کہ یہ کیا دیت ہے	گفتا کہ ذرا بے باورے اِس ملک کی یہ ریت ہے
ہمنا تمھیں کو دل دیا تم دل لیا اور دُکھ دیا	ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے
سعدی بگفتا ریختہ در ریختہ دُر ریختہ	شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

مرزا رفیع سودا نے اپنے تذکرہ میں اُن اشعار کو شیخ سعدی شیرازی کے نام پر لکھا ہے مگر حکیم قدرت اللہ خان قاسم نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس شخص کو سعدی شیرازی سمجھنا جیسا کہ بعض تذکرہ نویسوں نے دھوکا کھایا ہے محض غلط ہے۔

سر گوراوسلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ کی ایک نظم دیکھی گئی ہے جس میں اُس نے اٹھارہ مختلف زبانیں اُن ملکوں کی لکھی ہیں جہاں جہاں وہ سیاحی کو گیا ہے۔ اس بیان میں ظاہراً کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ایک مدت دراز تک وہ ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں سفر کرتا رہا ہے اور اکثر جگہ اُس نے بہت بہت دیر تک قیام کیا ہے۔ شام، عراق، فلسطین، مصر، یمن اور ہندستان میں مدت دراز تک مقام کرنا خود اُس کے کلام سے ثابت ہوتا ہے پس ضرور ہے کہ وہ اِن ملکوں کی زبان سے کافی واقفیت رکھتا ہو اس کے سوا اُس نے اور بہت سے ملکوں کی سیر کی ہے جس میں سے اکثر کا ذکر گلستان اور بوستان میں کیا ہے۔

شیخ کی سیاحت کا حال

سر گوراوسلی لکھتے ہیں کہ مشرقی سیاحوں میں ابن بطوطا کے سوا شیخ سعدی سے بڑھ کر اور کوئی سیاح ہم نے نہیں سنا۔ اُس نے ایشیاے کوچک، بربر، حبش، مصر، شام، فلسطین، آرمینیا، عرب جملہ ممالکِ ایران، اکثر ممالکِ توران، ہندستان، رودبار، دیلم، کاشغر اور جیحون سے آگے تک اور بصرہ و بغداد سے ستھین دال [1] تک کی سیر کی تھی'' صاحب موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ کو چار دفعہ ہندستان میں آنے کا اتفاق ہوا ہے۔ از اں جملہ ایک دفعہ پٹھان اغلمش کے وقت میں اور دو دفعہ خاص امیر خسرو سے ملنے کو دہلی آیا ہے'' ہمارے نزدیک یہ مضمون بالکل بے سروپا ہے۔ اغلمش کوئی بادشاہ ہندستان میں نہیں ہوا شاید سلطان التمش کے دھوکے میں اغلمش لکھا گیا۔ بیشک شیخ نے اغلمش کا ذکر گلستان میں ایک جگہ کیا ہے جہاں یہ لکھا ہے ''سرہنگ زادہ را بر در سراے اغلمش دیدم'' مگر ہندستان میں کوئی اغلمش یا سراے اغلمش نہیں سنی گئی۔ سعدی اور امیر خسرو کی ملاقات بھی ثابت نہیں ہوتی۔ اگر چہ اکثر تذکرہ نویسوں کو یہ شبہ ہوا ہے۔ شیخ آذری نے بھی اپنی کتاب جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ امیر کے دیکھنے کو شیراز سے ہندستان میں آیا ہے۔ مگر اس کا کچھ ثبوت نہیں ہے بلکہ شیخ اور امیر خسرو کے عصر کا مقابلہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا امیر کے ملنے کے لیے آنا خلاف قیاس ہے خسرو کی ولادت 651 ہجری میں ہوئی ہے جب کہ شیخ کی عمر ستر برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اب اگر امیر خسرو کی شہرت بفرض محال پچیس برس ہی کی عمر میں ایران تک پہونچ گئی تھی تو اس وقت شیخ کی عمر تقریباً سو برس کی ہونی چاہیے۔ پس یہ کیونکر خیال میں آتا ہے کہ ایک سو برس کا شیخ جو شاعری میں یگانہ وقت اور مقبول خاص و عام ہو ایک پچیس برس کے لڑکے کی شہرت سن کر ایران سے ہندستان آئے۔ البتہ معتبر حوالوں سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ سلطان

1۔ ستھین دال سے مراد شاید سد سکندری ہے کیونکہ شیخ نے ایک جگہ اپنے دیوان میں تصریح کی ہے کہ میں سد سکندری تک گیا ہوں۔

غیاث الدین بلبن کے بیٹے قاآن محمد سلطان ناظم ملتان نے جس کو خان شہید کہتے ہیں شیخ سے دو بار درخواست کی کہ آپ شیراز سے یہاں آیئے۔ اور چونکہ امیر خسرو اس وقت محمد سلطان کے مصاحبوں میں تھے اس لیے ان کا کلام بھی شیخ کے ملاحظہ کے لیے بھیجا۔ شیخ اس وقت بہت معمر ہو گیا تھا اس سبب سے خود نہ آسکا۔ لیکن دونوں دفعہ اپنے دو دیوان اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے خان شہید کو بھیجے اور امیر خسرو کی نسبت یہ لکھا کہ اِس جوہر قابل کی تربیت اور قدر افزائی کرنی چاہیے۔

شیخ کا ہندستان میں چار دفعہ آنا بھی ثابت نہیں ہے۔ صرف بوستان سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے سومنات سے نکل کر ایک بار مغربی ہندستان کا دورہ کیا ہے اور وہاں سے بحر ہند اور بحر عرب کی راہ یمن اور حجاز میں پہنچا ہے۔

شیخ کے سفر جس قدر گلستان اور بوستان سے ثابت ہوتے ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے کہ مشرق میں خراسان ترکستان اور تاتار تک گیا ہے اور بلخ و کاشغر وغیرہ میں مقیم رہا ہے جنوب میں سومنات تک آیا اور ایک مدت یہاں ٹھہرا اور سومنات سے مغربی ہندستان میں پھر کر دریا کی راہ سے عرب چلا گیا۔ شمال و مغرب کی طرف عراق عجم، آذربیجان، عراق، عرب، شام فلسطین اور ایشیاے کوچک میں بارہا اُس کا گزر ہوا ہے۔ اصفہان، تبریز، بصرہ، کوفہ، واسط بیت المقدس، طرابلس الشرق، دمشق، دیار بکر اور اقصاے روم کے شہروں اور قریوں میں مدت دراز تک اُس کی آمد و رفت رہی ہے۔ مغرب کی جانب عرب اور افریقہ میں اُس کا بار بار جانا اور وہاں ٹھہرنا معلوم ہوتا ہے۔ ہندستان سے مراجعت کے وقت یمن میں جانا۔ صنعا میں ایک مدت تک قیام کرنا۔ حجاز میں پہنچنا۔ اسکندریہ۔ مصر اور حبش کے واقعات اُس کے کلام میں مذکور ہیں۔

شیخ نے دریا میں بھی بارہا سفر کیا ہے۔ خلیج فارس، بحر عمان، بحر ہند، بحر عرب، بحر قلزم اور بحر روم میں اُس کے متعدد سفر ثابت ہوتے ہیں۔ چیمبرز انسائکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ وہ یوروپ کے اکثر ملکوں میں پھرا ہے لیکن شیخ کے کلام سے کہیں یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ اکثر تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شیخ نے چودہ حج پیادہ پا کیے ہیں اور خود شیخ کے کلام سے بھی ایسا ہی ثابت ہوتا ہے وہ ایک سفر کا حال بوستان میں اِس طرح لکھتا ہے کہ بیابان فید میں ایک رات

نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ میں چلتے چلتے سر راہ پڑ کر سو رہا پیچھے سے ایک شتر سوار آیا اور اُس نے اونٹ کی نکیل میرے سر پر مار کر کہا کہ کیا تو نے مرنے کا ارادہ کیا ہے جو جرس کی آواز سن کر بھی نہیں اُٹھتا، بیابان فید جس کا اس حکایت میں ذکر ہے ایک صحرائے لق و دق چھ سو میل لمبا اور چار سو میل چوڑا ہے۔ جو حجاج کوفہ سے مکہ معظمہ کو جاتے ہیں اُن کے رستے کے بیچوں بیچ فید ایک بستی ہے جس کے نام سے یہ صحرا مشہور ہے۔ فید کوفہ سے تقریباً تین سو پچیس میل ہے اور اسی قدر مسافت پر وہاں سے مکہ معظمہ ہے۔ اِس صحرا میں پانی نہایت کمیاب ہے اور آبادی کہیں نظر نہیں آتی۔ ایسی راہ سے پیادہ پا حج کو جانا ظاہر کرتا ہے کہ شیخ نے کیسی کیسی صعوبتیں سفر میں اُٹھائی ہیں۔

کریم خان ژند نے اپنے عہد حکومت میں شیراز کے قریب ایک احاطہ بنوایا ہے جو ہفتن کے نام سے مشہور ہے اُس میں سات مجہول الاسم درویشوں کی قبریں بنی ہوئی ہیں اور احاطہ کے دروازہ پر شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کی شبیہیں نصف قد کی لگی ہوئی ہیں۔ کپتان کلارک نے جو بوستان کا ترجمہ انگریزی میں چھاپا ہے۔ اُس میں شیخ کی اُس تصویر [1] کا فوٹو گراف بھی چھاپا ہے شیخ کی شبیہ میں ایک کشکول اُس کے ہاتھ میں اور ایک تبر اُس کے کندھے پر ہے جو کہ اُس ملک کے سفر کرنے والوں کی خاص علامت ہے۔

شیخ کے کلام سے بھی جا بجا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ بے سروسامان اور متوکل درویشوں کی طرح سفر کرتا رہا ہے۔ اور بعض موقعوں پر اُس کو حالت سفر میں نہایت سخت تکلیفیں اور ایذائیں پہنچی ہیں۔

ساتویں صدی ہجری اور بارہویں صدی عیسوی کے وسط میں جب کہ صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ فلسطین میں ختم نہ ہوا تھا اور مسلمان اور عیسائیوں کے باہم سخت خصومت اور عداوت ہو رہی تھی شیخ پر ایک سخت واقعہ گزرا ہے جس کا ذکر گلستان کے دوسرے باب میں کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار اہلِ دمشق سے ناراض ہو کر اُس نے بیابان قدس یعنی فلسطین کے جنگلوں میں رہنا اختیار کیا تھا اور آدمیوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ آخر وہاں کے عیسائیوں نے اُس کو پکڑ کر قید کر لیا۔ اُس وقت طرابلس الشرق یعنی مشرق کی ٹریپولی میں شہر کے استحکام

1۔ بنی صاحب ایک سیاح نے اپنے ایران کے سفر نامہ میں اس تصویر کا حال مفصل لکھا ہے۔

اور حفاظت کے لیے شہر میں خندق تیار ہو رہی تھی اور یہودی اسیروں سے (جن کو یورپ کے عیسائی بلکیر یا اور ہنگری وغیرہ سے گرفتار کر کے لائے تھے) مزدوری کا کام لیا جاتا تھا۔ شیخ کو بھی یہودیوں کے ساتھ خندق کے کام پر لگا یا۔ مدت کے بعد حلب کا ایک معزز آدمی جو شیخ کا واقف کار تھا اُس طرف سے گزرا اور شیخ کو پہچان کر اُس سے پوچھا کہ یہ کیا حالت ہے۔ شیخ نے کچھ درد انگیز اشعار پڑھے اور یہ کہا کہ خدا کی قدرت ہے۔ جو شخص یگانوں سے کوسوں بھاگتا تھا وہ آج بیگانوں کے پنجہ میں گرفتار ہے۔ رئیس حلب کو اُس کے حال پر رحم آیا اور دس دینار دے کر شیخ کو قید فرنگ سے چھڑا دیا اور اپنے ساتھ حلب میں لے گیا۔ اُس کی ایک بیٹی ناکتخدا تھی شیخ کا نکاح سو دینار مہر پر مقرر کر کے اُس کے ساتھ کر دیا۔ کچھ مدت وہاں گزری۔ مگر بیوی کی بدمزاجی اور زبان درازی سے شیخ کا دم ناک میں آ گیا۔ ایک بار اُس نے شیخ کو یہ طعنہ دیا کہ آپ وہی نہیں جس کو میرے باپ نے دس دینار دے کر خریدا ہے؟ شیخ نے کہا ہاں بیشک میں وہی ہوں دس دینار دے کر مجھے خریدا اور سو دینار پر آپ کے ہاتھ بیچا۔

نفحات الانس میں لکھا ہے کہ شیخ نے بہت مدت تک بیت المقدس اور شام کے شہروں میں سقائی کی ہے۔ غالباً یہ وہی زمانا ہے جس کا ذکر اس حکایت میں کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے اُس پر ایسی ایسی تکلیفیں اور سختیاں اکثر گزری ہیں۔ وہ گلستان میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں نے کبھی زمانے کی سختی اور آسمان کی گردش کا شکوہ نہیں کیا۔ مگر ایک موقع پر دامن استقلال ہاتھ سے چھوٹ گیا کہ نہ میرے پاؤں میں جوتی تھی اور نہ جوتی خریدنے کا مقدور تھا۔ اسی حالت میں غمگین اور تنگدل کوفہ کی جامع مسجد میں پہنچا۔ وہاں ایک شخص کو دیکھا کہ جس کے پاؤں ہی سرے سے نہ تھے۔ اُس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے ننگے پاؤں غنیمت سمجھے۔

عالم غربت میں کبھی کبھی عُسرت اور تنگی کا ہونا ایک لازمی امر تھا مگر شیخ ایسے موقعوں پر خودداری کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ ایک سال اسکندریہ میں جب کہ شیخ وہاں موجود تھا نہایت سخت قحط پڑا اور درویشوں پر بہت سختی گزرنے لگی۔ اُس زمانے میں وہاں ایک ہیجڑا نہایت دولتمند تھا۔ غریبوں اور پردیسیوں کو اُس کے ہاں سے کھانا یا نقدی ملتی تھی۔ کچھ درویش جو غالباً شیخ کے رفقا میں سے تھے شیخ کے پاس آئے اور اُس ہیجڑے کے ہاں دعوت میں چلنے کی تحریک کی شیخ نے اُن کے ساتھ دعوت میں چلنے سے انکار کیا اور کہا کہ شیر بھوک کے مارے مر

بھی جائے تو بھی کتے کا جھوٹا نہیں کھاتا۔

شیخ کے وقائع سفر میں جو کہ اُس نے گلستان اور بوستان میں بیان کیے ہیں سب سے زیادہ عجیب سومنات کا واقعہ ہے جو بوستان کے آٹھویں باب میں مذکور ہے یعنی شیخ لکھتے ہیں کہ جب میں سومنات میں پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بت کی پرستش کے لیے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اُس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھ کو تعجب ہوا کہ جاندار ایک بے جان چیز کی کس لیے پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی۔ ایک روز اُس سے پوچھا یہ لوگ اس بےحس مورت پر کیوں اس قدر فریفتہ ہیں۔ اور اُس کے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پجاریوں کو خبر کر دی۔ سب نے مجھ کو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً اُن کے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بداعتقادی سے نہیں کہی۔ میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں۔ لیکن چونکہ میں نو وارد ہوں اور اسرار نہانی سے ناواقف ہوں اس لیے اس کی حقیقت دریافت کرنی چاہتا ہوں تا کہ سمجھ بوجھ کر اس کی پوجا کروں۔ اُس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات کو تو مندر میں رہ۔ تجھ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ میں رات بھر وہاں رہا صبح کے قریب تمام بستی کے مرد وعورت وہاں جمع ہو گئے اور اُس مورت نے اپنا ہاتھ اُٹھایا جیسے کوئی دعا مانگتا ہے یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنس کر مجھ سے کہا ''کیوں اب تو کچھ شبہ باقی نہیں رہا''؟ میں نے ظاہرداری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس مورت کے سامنے لے گئے۔ میں مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بظاہر چند روز کے لیے برہمن بن گیا۔ جب مندر میں میرا اعتبار بڑھ گیا تو ایک روز رات کو جب سب چلے گئے میں نے مندر کا دروازہ تو بند کر دیا اور مورت کے تخت کے پاس جا کر غور سے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ وہاں مجھے ایک پردہ نظر آیا جس کے پیچھے ایک پجاری چھپا ہوا بیٹھا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ایک ڈور تھی۔ معلوم ہوا کہ جب اُس ڈور کو کھینچتا ہے فوراً اُس مورت کا ہاتھ اُٹھ جاتا ہے اسی کو عام لوگ اُس کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ اُس پجاری نے جب دیکھا کہ راز فاش ہو گیا وہ کھسیانا سا ہو کر وہاں سے بھاگا۔ میں بھی اُس کے پیچھے دوڑا اور اس خوف سے کہ کہیں مجھ کو

پکڑوا کر مردانہ ڈالے اُس کو پکڑ کر ایک کنویں میں گرادیا۔ اِس کے بعد فوراً میں وہاں سے بھاگ نکلا اور ہندستان میں ہوتا ہوا یمن کے رستے حجاز میں پہنچا۔

اِس حکایت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ایک ایسے بڑے مندر میں جہاں ہزاروں پجاری اور سینکڑوں بھجن گانے والے مرد اور عورت اور سینکڑوں جاتری شب و روز موجود رہتے تھے وہاں ایک مشتبہ آدمی کو ایسا موقع کیونکر ملا کہ تمام مندر میں اُس کے سوا کوئی متنفس باقی نہ رہا اِس کے سوا ایسے سناٹے کے وقت جب کہ مندر میں کوئی متنفس موجود نہ تھا پردہ کے پیچھے ایک پجاری کا ڈور تھام کر بیٹھنا کس غرض سے اور کیوں تھا۔

اِس اعتراض کے جواب میں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید اصل واقعہ یعنی سومنات میں جانا اور مندر میں ہندو بن کر رہنا اور ایک شخص کو اپنی جان کے خوف سے کنویں میں ڈھکیل کر بھاگ جانا صحیح ہو مگر اُس صورت میں یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اِس واقعہ کے تمام جزئیات کی تصویر شیخ سے پوری پوری نہیں کھنچ سکی۔ اصل یہ ہے جب کوئی واقعہ نظم میں بیان کیا جاتا ہے تو شاعر کو اکثر وزن و قافیہ کی ضرورت سے کہیں کہیں اصل مدعا میں ضرور کمی بیشی کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات وہ شاعرانہ خیالات کی رو میں بہہ کر اصل واقعہ سے دور جا پڑتا ہے۔ پس اگر اس واقعہ سے کسی کی غرض متعلق نہیں ہوتی تو کسی کا اُس کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ ورنہ اہل غرض کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مثلاً شیخ نے بوستان کے اِسی باب میں ایک بادشاہ زادہ کی حکایت صرف گیارہ بیت کی لکھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گھوڑے سے گر کر اس کی گردن کو ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ وہ ہر پھر نہ سکتی تھی مگر ایک حکیم کے علاج سے اچھی ہوگئی۔ کسی قدر صحت کے بعد جب طبیب ملنے کو آیا تو اُس کی طرف کچھ التفات نہ کیا۔ طبیب وہاں سے دل میں ناخوش ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے روز ایک دوا بھیجی کہ اِس کی دھونی سے بالکل آرام ہو جائے گا۔ اُس سے بادشاہ کو ایک چھینک آئی اور اُس کی گردن جیسے چوٹ لگنے پر ہوگئی تھی ویسی ہی پھر ہوگئی۔ اسی حکایت کو شیخ نے ایک اور 34 بیت کی مثنوی میں جو بحر ہزج میں ہے بیان کیا ہے اور یہ اُس کی کلیات میں موجود ہے۔ اِن دونوں مثنویوں میں قصہ کے جزئیات مختلف ہیں۔ مختصر حکایت میں سرزمین یونان کا حکیم اور طولانی حکایت میں صرف حکیم لکھا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بوٹی بھیجی تھی اور دوسری جگہ ایک تخم بھیجا تھا۔ ایک جگہ

بادشاہ کا قصہ لکھا ہے اور دوسری جگہ ایک نبرد آزما کا۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ اُسی دوا کی دھونی سے چھینک آئی دوسری جگہ چھینک وغیرہ کا کچھ ذکر نہیں۔

اِس سے صاف ظاہر ہے کہ نظم میں بشرطیکہ ناظم کو حسن بیان اور زینت الفاظ کا پورا پورا خیال ہو قصبہ کے جزئیات کا اپنی اصلی حالت پر باقی رہنا نہایت دشوار ہے۔ پس بہ نسبت اِس کے کہ شیخ پر غلط بیانی کا الزام لگایا جائے یہ بہتر ہے کہ اِس کے بیان کو اس مقام پر ادائے مطلب میں قاصر سمجھا جائے۔

شیخ کا سفر کے بعد وطن میں آنا

ہم اُوپر لکھ چکے ہیں کہ شیخ نے سعد زنگی کے ابتدائے حکومت میں تحصیل علم کے لیے ترک وطن اختیار کیا تھا۔ سعد زنگی چھٹی صدی کے آخر میں تخت نشیں ہوا اور 623 ہجری میں وفات پائی۔ غالبًا شیخ شیراز سے نکل کر سعد زنگی کے زمانہ میں وطن نہیں آیا۔ کیونکہ اُس نے شیراز سے چلتے وقت وہاں کی حالت نہایت ابتر وخراب دیکھی تھی۔ اتابک ازبک پہلوان اور سلطان غیاث الدین کے حملے اور شہر کا تاخت وتاراج ہونا اپنی آنکھ سے دیکھ گیا تھا۔ مگر جب سعد زنگی کا بیٹا قتلغ خان ابوبکر اپنے باپ کی جگہ تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو اُس نے فارس کو جو دوسو برس سے مورد آفات وحوادث تھا چندروز میں سرسبز وشاداب کر دیا۔ اگرچہ مورخین نے اس کی تعریف میں بہت مبالغے کیے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ اُس نے اپنی خوبیوں کے سبب بے انتہا شہرت اور نیکنامی حاصل کی تھی۔ اطراف وجوانب سے مشائخ وزہّاد اُس کی شہرت سن کر آتے اور اُن کی کمال تعظیم واحترام کیا جاتا تھا۔ شیراز کی خانقاہیں، عبادت خانے، مدرسے اور مسجدیں جو ویران ہوگئی تھیں اُس کے عہد میں آباد کی گئیں۔ اور ایسی عمارتوں کی امداد کے لیے گاؤں اور جاگیریں وقف کیں۔ ایک شفاخانہ شیراز میں بنوایا اور بڑے بڑے حاذق طبیب اُس پر مامور کیے۔ اپنی دانشمندی اور حسن تدبیر سے ملک فارس کو ہمیشہ مغول تاتار کے سیلاب بلا سے جس کی کہیں پناہ نہ تھی محفوظ رکھا۔ اور 623ء سے 658ء تک سلطنت کی۔ مدت تک اُس کے عہد میں بھی شیخ نے شیراز کا رُخ نہیں کیا اور اطراف

و جوانب میں سیر وسیاحت کرتا رہا۔ مگر جب ابوبکر کا شہرہ دور و نزدیک برابر سننے میں آیا اور وطن کا اشتیاق بھی حد سے زیادہ گزر گیا اور وطن میں قرار واقعی امن وامان قایم ہوگیا تب شام سے عراق عجم ہوتا ہوا اور اصفہان میں ٹھہرتا ہوا جیسا کہ بوستان کی ایک حکایت سے مفہوم ہوتا ہے شیراز میں پہنچا۔ شیخ کی کلیات میں ایک قطعہ ملا ہے جس سے ثابت ہے کہ اُس نے ایک مدت دراز کے بعد ابوبکر سعد کے عہد میں شیراز کی طرف معاودت کی تھی۔ وہ قطعہ بجنسہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

قطعہ

اشعار	ترجمہ
1 ندانی کہ من در اقالیم غربت چرا روزگارے بکردم درنگی	1 تجھ کو معلوم نہیں؟ کہ میں نے پردیس میں ایک مدت تک کیوں توقف کیا۔
2 برون رفتم زتنگ ترکان کہ دیدم جہان درہم اُفتادہ چون موے زنگی	2 میں ترکوں کی چپقلش سے نکل بھاگا کیونکہ ملک حبشی کے بالوں کی طرح ژولیدہ ہو رہا تھا۔
3 ہمہ آدمی زادبودند لیکن چو گرگان بخونخوارگی تیز چنگی	3 سب آدمی کے بچے تھے لیکن خونخواری میں بھیڑیوں کی طرح تیز ناخن رکھتے تھے۔
4 درون مردمی چون ملک نیک محضر برون لشکرے چون ہزبران جنگی	4 شہر کے اندر فرشتہ خصلت لوگ تھے اور باہر شہر کے لوگ جنگی مانند شیروں کے تھے۔
5 چو باز آمدم کشور آسودہ دیدم پلنگان رہا کردہ خوئے پلنگی	5 جب میں پلٹ کر آیا تو ملک کو آسودہ پایا کہ درندوں نے درندگی کی خصلت چھوڑ دی تھی۔
6 چنان بود در عہد اول کہ دیدم جہان پرزآشوب و تشویش و تنگی	6 اگلے زمانہ میں جب کہ ملک کو آشفتہ اور پریشان اور تنگ دیکھا تھا ملک کا وہ حال تھا۔

7 چنین شد در ایامِ سلطان عادل اتابک ابوبکر بن سعد زنگی | 7 اور اب بادشاہ عادل ابوبکر بن سعد زنگی کے عہد میں یہ حال ہوگیا ہے۔

شیراز میں پہنچ کر ظاہراً شیخ نے جامۂ علم وفضیلت اُتار کر بالائے طاق رکھ دیا تھا کیونکہ اتابک ابوبکر میں باوجود اُن تمام خوبیوں کے جو اوپر مذکور ہوئیں ایک نہایت سخت عیب بھی تھا۔ وہ ہمیشہ علماء وفضلاء سے بدگمان رہتا تھا اور جاہل فقیروں اور درویشوں کو بہت کچھ دیتا تھا اور اُن کے ساتھ کمالِ ارادت وعقیدت ظاہر کرتا۔ اسی بدگمانی کے سبب سے چند جلیل القدر آئمہ وعلماء کو اُس نے جبراً شیراز سے نکلوا دیا تھا۔ از انجملہ امام صدرالدین محمود واعظ اور امام شہاب الدین تو دہ پشتی اور مولانا عزالدین ابراہیم قیسی کو کہ اقسامِ علوم میں یگانۂ روزگار تھے بہت زجر وتہدید کے ساتھ شیراز سے نکلوا دیا۔ قاضی عزالدین علوی جو کہ سندی سید اور دارالملک کا قاضی القضاۃ تھا اُس کا تمام مال واسباب ضبط کرلیا۔ صاحب سعید عمید الدین اسعد کو جو کہ بے مثل ادیب تھا اور سعد زنگی کا نہایت عالی مرتبہ وزیر تھا ماخوذ کیا اور معہ اُس کے بیٹے تاج الدین محمد کے ایک قلعہ میں قید کردیا یہاں تک کہ وہ قید ہی میں مرگیا۔

اِسی سبب سے اہلِ علم اپنا کمال علمی ظاہر کرنے سے ڈرتے تھے اور اکثر جُہلا مشائخ کے لباس میں جلوہ گر ہوتے تھے۔ تاریخ وصاف میں لکھا ہے کہ ایک جاہل آدمی مشیخت مآب بن کر ابوبکر کے دربار میں آیا۔ اتابک نے اُس کی بہت تعظیم وتکریم کی اور جب نمازِ مغرب کا وقت آیا تو اسی کو امام بنایا۔ شاہ صاحب نے قرأت غلط پڑھی مگر جس قدر اُنھوں نے قرأت میں غلطیاں کیں اُسی قدر اتابک کو اُن کے ساتھ زیادہ عقیدت ہوئی اور بہت کچھ دے کر اُنھیں رخصت کیا۔

پس شیخ کے لیے علماء کے لباس میں رہنا زیادہ خطرناک تھا کیونکہ بہت سی صفات اُس میں ایسی جمع تھیں جن کے سبب سے اُس کا مرجع خلایق بننا ایک ضروری امر تھا۔ مثلاً علم وفضل، شاعری، لطیفہ گوئی وبذلہ سنجی، فقر و درویشی وغیرہ وغیرہ اور اہلِ علم کے مرجع خلایق بننے سے ابوبکر ہمیشہ خائف رہتا تھا۔ اِس کے علاوہ بادشاہوں اور عالموں کے چال چلن پر خوردہ گیری کرنی ریاکار فقیروں اور جاہل درویشوں کی قلعی کھولنے اور اسی طرح کے اور بہت سے مفید خیالات اپنی نظم ونثر میں ظاہر کرنے شیخ کا اصلی مقصد تھا اور اس غرض کے لیے علماء اور واعظین

کے لباس میں رہنا ہرگز مناسب نہ تھا ظاہرا وہ اسی سبب سے جیسا گلستان کے دیباچہ میں مذکور ہے ابوبکر کے دربار میں بہت کم جاتا تھا۔ زیادہ تر سعد بن ابی بکر کو جس کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ کے کلیات میں موجود ہے۔ اس سے ارادت اور عقیدت تھی اور اُسی کے نام پر گلستان لکھی گئی ہے۔

خودمختار سلطنتوں میں کوئی شے رائے کی آزادی اور خاص کر بادشاہوں کے چال چلن پر آزادانہ رائے دینے سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتی۔ مگر شیخ نے جس کے وقت میں ہر بادشاہ حاکم علی الاطلاق تھا اس فرض کو پورا پورا ادا کیا۔ سلاطین عہد کے اخلاقی عیب اور اُن کی بدخصلتیں جس طرح اُس نے بیان کی ہیں آزاد سلطنتوں میں بھی اس سے زیادہ لکھنی مشکل ہیں مگر اُس نے ایسے لطیف پیرایوں میں اُن پر چوٹیں کی ہیں کہ کسی کو اُس پر گرفت کا موقع نہیں ملا۔ اکثر سلاطین سلف کی حکایتوں کے ضمن میں موجودہ بادشاہوں کے چال چلن پر اُس نے تعریفیں کی ہیں۔ کہیں مدحیہ قصائد میں اول مدح وستایش کی تھوڑی سی چاٹ دے کر نصیحت و پند کا دفتر کھولا ہے اور اُن کو ظلم وتعدی کے بُرے نتائج سے متنبہ کیا ہے اور طرح طرح سے رعیت کے حقوق جتائے ہیں اور اُن کی بے اعتدالیاں ظاہر کی ہیں۔ اتابک جو علماء کا مخالف اور مشائخ و زہاد کا حد سے زیادہ معتقد تھا اس کی تنبیہ کے واسطے گلستان اور بوستان میں اُس نے بہت سی حکایتیں لکھی ہیں۔ مثلاً گلستان کی ایک حکایت میں کسی درویش کا حال لکھا ہے جو کہ جنگل میں رہتا تھا اور درختوں کے پتے کھاتا تھا۔ ایک بادشاہ اُس کی زیارت کو گیا اور اُس کو شہر میں لے آیا اور ایک عمدہ بستان سرا میں اُتارا۔ چند روز جو اچھے اچھے کھانے کو اور نفیس کپڑے پہننے کو اور خوبصورت لونڈیاں خدمت کرنے کو ملیں اور ہر طرح کے آرام و آسایش پائی شاہ صاحب نے خوب رنگ وروغن نکالا۔ ہیئت وصورت بالکل بدل گئی۔ ایک دن بادشاہ قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا اور کہا جس قدر کہ مجھ کو علماء اور زہاد سے محبت ہے ایسی اور کسی گروہ سے نہیں فیلسوف وزیر نے عرض کیا حضور! شرط دوستی یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ بھلائی کی جائے اور اس لیے علماء کو روپیہ دینا چاہیے تاکہ اطمینان سے درس اور تصنیف میں مصروف رہیں اور زاہدوں کو کچھ نہ دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے زہد پر قایم رہیں۔

ایک اور اِس سے زیادہ لطیف اور چبھتی ہوئی حکایت اسی باب میں لکھی ہے جو بالکل

اتا بک ابوبکر کی حالت کے مناسب ہے یعنی ''ایک بادشاہ کو سخت مہم پیش آئی اُس نے منت مانی کہ اگر اس میں کامیابی ہوگی تو اس قدر روپیہ زاہدوں کی نذر کروں گا جب اُس کی مراد پوری ہوگئی تو اپنے عہد کے موافق روپیوں کی تھیلی غلام کو دی کہ زاہدوں کو جا کر دے آئے غلام بہت ہوشیار اور زیرک تھا۔ سارے دن اِدھر اُدھر پھرا اور شام کو تھیلی ہاتھ میں لیے جیسا گیا تھا ویسا ہی چلا آیا اور عرض کیا حضور! ہر چند ڈھونڈا مگر کوئی زاہد نہیں ملا۔ بادشاہ نے کہا تو کیا بکتا ہے! میرے نزدیک اس شہر میں چار سو زاہد سے کم نہ ہوں گے کہا حضور! جو زاہد ہیں وہ لیتے نہیں اور جو لیتے ہیں وہ زاہد نہیں۔ بادشاہ یہ بات سن کر ہنس پڑا اور فرمایا کہ جتنی مجھ کو درویشوں اور خدا پرستوں سے عقیدت ہے اُسی قدر اس مردود کو اِن سے عداوت ہے مگر کہتا سب سچ ہے'' اسی طرح کی اور بہت سی حکایتیں گلستان اور بوستان میں موجود ہیں۔ گلستان کی ایک حکایت میں جو کہ جدال سعدی کے نام سے مشہور ہے اُس نے نہایت خوبصورتی سے سلاطین عہد اور مشائخ روزگار کے عیب اور بُرائیاں بیان کی ہیں۔ اِس حکایت میں اُس نے اپنا اور ایک درویش کا غالباً فرضی مناظرہ لکھا ہے جس میں مخالف کو درویشوں کا اور اپنے کو امیروں اور بادشاہوں کا طرفدار اور مداح قرار دیا ہے مخالف بار بار درویشوں کی تعریف اور دولتمندوں کی مذمت کرتا ہے اور شیخ ہر دفعہ اُس کی تردید میں درویشوں کے عیب اور امیروں کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔ مگر جیسی مضبوط دلیلیں اپنے دعوے پر قایم کرتا ہے ویسی ہی مضبوط دلیلیں خصم کی طرف سے لکھتا ہے۔ اور اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک فرضی مناظرہ ہے جو محض درویشوں اور تونگروں کی تنبیہ اور اصلاح کے لیے لکھا گیا ہے۔

بادشاہوں کے جور و ظلم اور بے باکی و سفاکی دیکھتے دیکھتے شیخ کے دل میں فی الواقع بنی نوع کی خیر خواہی کا سچا جوش پیدا ہوگیا تھا جس کو کوئی خوف اور اندیشہ روک نہ سکتا تھا۔ ایک بار جب کہ وہ حج کر کے تبریز میں پہنچا اور وہاں کے علماء اور صلحا سے ملاقات کی اُس نے یہ ارادہ کیا کہ خواجہ شمس الدین جوینی صاحب دیوان اور اُس کا چھوٹا بھائی خواجہ علاء الدین جوینی جو کہ سلطان اباقاخان [1] کے معتمد وزیر تھے اور شیخ کے ساتھ خاص ارادت رکھتے تھے اُن سے بھی ملاقات کرے ایک روز اُن سے ملنے کا ارادہ کر کے چلا۔ راہ میں دیکھا اباقاخان

1۔ ہلاکوخان کا بیٹا جو اُس کے بعد بادشاہ ہوا۔

کی سواری آتی ہے اور اُس کے دونوں وزیر اُس کے ہمراہ سوار ہیں۔ شیخ نے چاہا کہ وہاں سے کترا کر نکل جائے۔ مگر دونوں بھائیوں نے اُس کو پہچان لیا اور فوراً گھوڑوں سے اُتر کر شیخ کی طرف آئے اور نہایت تعظیم اور ادب سے شیخ کو سلام کیا اور اُس کے ہاتھ اور پاؤں پر بوسے دیے بادشاہ نے جو یہ حال دیکھا حاضرین سے کہنے لگا کہ شمس الدین نے کبھی ہماری تعظیم بھی اِس راہرو کی برابر نہیں کی یہ کون شخص ہے؟ جب دونوں بھائی شیخ سے مل کر واپس آئے تو ابا قاخان نے خواجہ شمس الدین سے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا جس کی تم نے اس قدر تعظیم کی صاحب دیوان نے عرض کیا حضور یہ ہمارا شیخ ہے حضور نے سنا ہوگا شیخ سعدی اسی کا نام ہے اور اس کا کلام ایک عالم میں مشہور و معروف ہے۔ ابا قاخان نے کہا کہ اِس سے ہم کو بھی ملواؤ۔ چنانچہ دونوں بھائی ایک روز شیخ کی خدمت میں گئے اور اُس کو بادشاہ کے حضور میں لائے۔ کسی قدر صحبت کے بعد جب شیخ چلنے لگا تو بادشاہ نے کہا کہ مجھ کو کچھ نصیحت کرو۔ شیخ نے کہا دنیا سے آخرت میں کوئی چیز ساتھ نہ جائے گی۔ مگر نیکی یا بدی۔ اب تم کو اختیار ہے جو منظور ہو سو لے جاؤ۔ ابا قاخان نے کہا اِس مضمون کو نظم کر دو تو بہتر ہو۔ شیخ نے اُسی وقت یہ قطعہ نظم کر کے پڑھا:

شہے کہ پاسِ رعیت نگاہ میدارد	حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی است
وگرنہ راعی خلق است۔ زہر مارش باد	کہ ہرچہ میخورد از جزیہ مسلمانی است

ابا قاخان یہ قطعہ سن کر آبدیدہ ہوگیا اور کئی بار شیخ سے پوچھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں۔ شیخ ہر بار یہی جواب دیتا تھا کہ اگر آپ راعی ہیں تو پہلی بیت آپ کے مناسب حال ہے ورنہ دوسری بیت۔ ابا قاخان شیخ کی اِس آزادانہ پند و موعظت سے نہایت خوش ہوا اور شیخ کو بہت عزت سے رخصت کیا۔

علی بن احمد جامع کلیات شیخ اس مقام پر لکھتا ہے کہ ہمارے زمانہ کے مشائخ وعلماء ایسی بیباکانہ نصیحت ایک بقال یا قصاب کو بھی نہیں کر سکتے اور اسی لیے زمانہ کا جو حال ہے وہ سب پر روشن ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شیخ کے یہ کلمات اُس وقت اور بھی زیادہ قدر کے لائق ہو جاتے ہیں جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ابا قاخان ہلاکو خان کا بیٹا اور چنگیز خان کا پوتا تھا جو اسلام اور

مسلمانوں کے جانی دشمن تھے۔ اگر چہ ابا قاخان کو مسلمانوں سے ویسی نفرت نہ تھی لیکن وہ بہرحال اسلام سے بیگانہ تھا اور ایک مسلمان شیخ یا واعظ کو اُس کے سامنے ایسی جرأت کرنی نہایت دشوار تھی ایسا کام اُسی شخص سے ہوسکتا ہے جس کو نہ جان کا خوف ہو نہ فائدہ کی اُمید جیسا کہ شیخ نے گلستان میں خود لکھا ہے ''نصیحت بادشاہان گفتن کسے را مسلّم است کہ بیم سر ندارد و اُمیدِ زر''۔

سردار انکیانو جو بعد زوال خاندان اتابکیہ کے 667 ہجری میں سلطان ابا قاخان کے حکم سے صوبہ فارس کی امارت اور حکومت پر مقرر ہوا تھا۔ ایک مغل صاحب ہیبت وشان نہایت رعب داب والا اور اپنے مذہب میں نہایت پختہ تھا۔ اور ہمیشہ علمائے اسلام سے مذہبی بحثیں کیا کرتا تھا۔ اور اُس کی ہیبت سے بڑے بڑے اہل منصب لرزتے تھے۔ غالباً اُس نے شیخ سے درخواست کی تھی جس کے موافق شیخ نے نثر میں ایک پندنامہ جو اُس کے کلیات میں موجود ہے سردار مذکور کے نام لکھ کر بھیجا ہے۔ اِس پندنامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے بادشاہ، حاکم اور عامل شیخ کے کلام کی نہایت تعظیم کرتے تھے اور اُس کی تلخ نصیحتوں کو شہد سے زیادہ شیریں سمجھتے تھے۔ سردار انکیانو کی شان میں شیخ نے قصائد بھی لکھے ہیں جو سراسر نصیحت و پند سے بھرے ہوئے ہیں یہاں تک کہ بعض قصائد دو تین مدحیہ اشعار کے سوا سراسر پند وموعظت ہی میں ختم کر دیے ہیں۔

شیخ کی عقیدت و ارادت ممالک ایران کے سوا شام وغیرہ میں بھی ایسی ہی تھی جیسی فارس اور عراق عجم میں۔ چنانچہ ایک دفعہ شیخ دمشق کی جامع مسجد میں حضرت یحییٰ کی تربت پر معتکف تھا۔ عرب کا ایک بادشاہ جو ظلم اور بے انصافی میں مشہور تھا مسجد میں آیا اور نماز و دعا سے فارغ ہو کر شیخ کے پاس گیا اور کہا مجھ کو ایک سخت دشمن سے حملہ کا اندیشہ ہے آپ میرے لیے دعا کریں۔ شیخ نے کہا کمزور رعیت پر رحم کرتا کہ زبردست دشمن سے محفوظ رہے جس نے بدی کا بیج بویا اور نیکی کی امید رکھی اُس نے ایک لغو خیال پکایا اور بیہودہ امید باندھی ہے۔

اگر چہ سلطنت عہد کے اعیان و ارکان میں شیخ کے معتقد اور ارادت مند بے شمار تھے لیکن خواجہ شمس الدین صاحب دیوان جس کے نام پر شیخ نے اپنے ایک مجموعہ نظم کا نام صاحبیہ رکھا ہے اور اُس کا بھائی علاء الدین جس نے سب سے اول مغول تاتار کی فتوحات کے بیان

میں "**تاریخ جہان کشا**" لکھی ہے شیخ کے ساتھ ایک خاص قسم کا خلوص اور محبت یا عقیدت رکھتے تھے۔ اس مقام پر کچھ مختصر حال اِن دونوں بھائیوں کا لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جوین جو کہ خراسان میں ایک سرسبز اور معمور خطہ تھا۔ یہ دونوں بھائی وہاں کے سندی سادات میں سے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے علم و فضل اور عقل و دانش کے ذریعہ سے خانان تاتار کے عہد حکومت میں اپنا مرتبہ وزارت تک پہنچایا تھا۔ ہلاکو خان نے وزیر سیف الدین کی شہادت کے بعد اپنی وزارت بالاستقلال خواجہ شمس الدین جوینی کو عطا کی تھی اور اُس کے چھوٹے بھائی علاء الدین کو ملک بغداد اور اُس کے مضافات پر حاکم مقرر کیا تھا۔ ہلاکو خان کے بعد اباقاخان باپ کا جانشیں ہوا تو اُس نے پہلے سے بھی شمس الدین کا زیادہ مرتبہ بڑھا دیا۔ اور سلطنت کی باگ بالکل اُس کے قبضہ میں دے دی۔ اب اُس نے مہمات سلطنت کے انصرام سپاہ و رعیت کی دلجوئی اور تمام ملکی خرابیوں کی اصلاح میں حد سے زیادہ کوشش کی۔ عراق، خراسان، بغداد، شام اور آرمینیہ کے بادشاہ اور حاکم سب اُس کے مطیع اور فرمانبردار تھے۔ اُس کی فیاضی اور سخاوت کی دھوم دور و نزدیک پہنچی تھی۔ باوجودیکہ اُس کا حکم کنارۂ جیحون سے شام اور ایشیاے کوچک تک نافذ اور جاری تھا۔ اس پر وہ علماء و فضلاء کے ساتھ کمال تواضع اور انکسار سے پیش آتا تھا اور اُن کے ساتھ حد سے زیادہ سلوک کرتا تھا۔ کبھی کسی پر اُس نے احسان نہیں جتایا ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں کی تعظیم و مدارات اُن کے مرتبہ کے موافق کرتا تھا اور علاوہ کمالات علمی کے علم ادب اور شعر میں بھی اُس کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ زیادہ تر اُسی کی بدولت تاتاریوں میں دین اسلام شایع ہوا اور اُسی کے فیض صحبت سے اباقاخان کے بھائی سلطان احمد [1] نے اپنے گھرانے میں سب سے اول اسلام قبول کیا آخر ارغون خان برادر سلطان احمد کے ہاتھ سے 663 ہجری میں شہید کیا گیا۔ شہادت سے چند ساعت پہلے اُس نے تھوڑی سی مہلت چاہی تھی اُس نازک وقت میں نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے بیٹوں کے نام ایک وصیت نامہ تحریر کیا اور ایک خط فضلاے تبریز کو لکھا جو کہ تاریخ وصاف میں بجنسہ منقول ہے اور جس سے اُس کا کمال استقلال اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہے۔

1۔ سلطان احمد کا نام اسلام سے پہلے نکودار تھا تاتاریوں میں اِس سے پہلے صرف برکہ خان جوجی خان کا بیٹا اور چنگیز خان کا پوتا مسلمان ہوا تھا جس کے پاس خوارزم ودشت قبچاق اور روس وغیرہ کی حکومت تھی۔

اُس کے چھوٹے بھائی علاء الدین جوینی نے بغداد کی حکومت کے زمانہ میں اُس اُجڑے اور ویران شہر کو جو کہ ہلاکو خان کے ظلم و بیداد سے بالکل پامال ہو گیا تھا چند روز میں اپنے عدل اور شفقت اور دلجوئی رعایا سے ازسر نو معمور کر دیا۔ نجف اشرف میں نہر کھدوائی جس میں ایک لاکھ دینار سے زیادہ صرف ہوا اور فرات کا پانی کوفہ کی مسجد میں لے گیا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ جو کام بڑے بڑے خلیفہ اور بادشاہوں سے نہ ہو سکے تھے وہ اِس فیاض اور دانشمند وزیر کی کوشش سے ظہور میں آئے تاریخ جہان کشا جو اُس نے تاتاریوں کی فتوحات کے بیان میں لکھی ہے وہ اُن تمام تاریخوں کا ماخذ ہے جو اس باب میں لکھی گئی ہیں۔

الغرض یہ دونوں بھائی جو دنیوی جاہ و اقتدار کے علاوہ کمالات علمی میں بھی امتیاز رکھتے تھے اور نیک سیرتی اور حسن اخلاق کے لحاظ سے بے مثل تھے۔ شیخ سعدی کے ساتھ اُن کو حد سے زیادہ خلوص اور اعتقاد تھا اور شیخ کو بھی جیسا کہ اُس کے قصائد و قطعات اور دیگر تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے اِن دونوں سے انتہا درجہ کی محبت اور الفت تھی۔ ظاہرا جب سے شیخ نے سفر ترک کر کے شیراز میں اقامت اختیار کی تھی اُس کے تمام اخراجات اور اُس کی خانقاہ کے مصارف کے متکفل خواجہ شمس الدین اور خواجہ علاء الدین تھے۔ ایک بار خواجہ شمس الدین نے پانچ سو دینار بطور نذر کے اپنے غلام کے ہاتھ دارالسلطنت تبریز سے شیخ کی خدمت میں بھیجے۔ راہ میں غلام نے شیخ کی معمولی اغماض اور چشم پوشی کے بھروسے پر اُس میں سے ڈیڑھ سو دینار نکال لیے اور ساڑھے تین سو شیخ کے حوالے کیے۔ شیخ نے دیکھا کہ صاحب دیوان کے خط میں پانچ سو لکھے ہیں اور غلام نے ساڑھے تین سو دیے ہیں اُس کی رسید میں یہ قطعہ لکھ بھیجا:

خواجہ تشریفم فرستادی و مال　　　مالت افزون باد و خصمت پائمال

ہر بدیناریت سالے عمر باد　　　تا بمانی سیصد و پنجاہ سال

ترجمہ: تم نے مجھ کو عزت دی اور نقدی بھیجی۔ تمھاری دولت زیادہ اور تمھارے دشمن پائمال ہوں۔ تمھاری عمر فی دینار ایک برس کے حساب سے ہو جیو تاکہ تم ساڑھے تین سو برس دنیا میں رہو۔

صاحب دیوان نے یہ مضمون دریافت کر کے غلام کو بہت زجر و توبیخ کی اور رقم کی بابت تدارک مافات کر کے شیخ سے معافی[1] چاہی۔ اس قسم کے مزاح آمیز اشعار اور بھی کئی موقعوں پر شیخ نے صاحب دیوان کو لکھے ہیں ایک بار اُس نے اپنی نظم و نثر کا مجموعہ خواجہ کو حسب الطلب بھیجا تھا۔ جب ایک مدت تک وہاں سے رسید نہ آئی تو اُس کے تقاضے کے لیے یہ قطعہ لکھ بھیجا:

قطعہ

سفینہ حکمیات و نظم و نثر لطیف — کہ بارگاہِ ملوک و صدور را شاید

بصدر صاحب صاحبقران فرستادم — مگر بعین عنایت قبول فرماید

سفینہ رفت و ندانم رسید یا نرسید — بدان دلیل کہ آیندہ دیر می آید

بپارسائے ازین حال مشورت بردم — مگر زخاطر من بند بستہ بکشاید

چہ گفت۔ گفت ندانی کہ خواجہ دریائیست — نہ ہر سفینۂ زود یا درست باز آید

ایک بار خواجہ علاء الدین نے جلال الدین ختنی کو جو کہ شیراز میں کسی جلیل القدر منصب پر مامور تھا تبریز سے یہ حکم بھیجا کہ اس قدر دینار شیخ کی خدمت میں بھیج دو مگر اُس وقت جلال الدین کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے وہ رقم شیخ کے پاس نہ پہنچی جب شیخ کو اِس حال کی اطلاع ہوئی تو اُس نے ہنسی سے خواجہ علاء الدین کو یہ قطعہ لکھ بھیجا:

قطعہ

پیام صاحب دیوان علاے دولت و دین — کہ دین بدولت ایام او ہمی نازد

1۔ برندق بخارائی جو ایک زبردست شاعر ہے اُس کو بھی یہ اتفاق پیش آیا ہے۔ بادشاہ نے اُس کو پانچ سو تومان انعام میں بھیجے تھے مگر اُس کو دو سو پہنچے اُس نے یہ قطعہ بادشاہ کو لکھ بھیجا۔ قطعہ

شاہ دشمن گداز دوست نواز — آن جہانگیر کو جہان داراست — بش یوز آلتون کرم نمود بمن — لطف سلطان ہندہ بسیار است

سہ صد از جملہ غائب است و کنون — در برآنم دو صد پدیدار است — یا مگر من غلط شنودستم — یا کہ پروانہ چی طلبگار است

یا مگر درعبارت تُرکی — بش یوز آلتون دویست دینار است

مگر اس قطعہ میں جیسا کہ ظاہر ہے شیخ کے قطعہ کی سی شوخی اور لطافت نہیں ہے۔ بش یوز آلتون کو بش یز التن پڑھنا چاہیے۔ یہ تُرکی الفاظ ہیں جن کا ترجمہ پانسو تومان ہے۔

رسید و پایۂ حرمت فزود سعدی را | بسے نماند کہ سر بر فلک بر افرازد
مثال داد کہ صدر ختن جلال الدین | قبول حضرت اورا تعہدے سازد
و لیک بر سر او خیل مرگ تاختہ بود | چنانکہ بر ہمہ ابنائے دہر می تازد
جلال زندہ نخواہد شدن درین دنیا | کہ بندگان خداوندگار بنوازد
مع بریدم ازو درسرائے عقبےٰ نیز | کہ از مظالم مردم بمن نہ پردازد

ترجمہ: صاحب دیوان علاء الدین جس کے عہد دولت پر دین کو ناز ہے اُس کی تحریر پہنچی اور سعدی کو عزت بخشی۔ قریب تھا کہ اُس کا سر آسماں تک پہنچ جائے۔ اُس میں حکم تھا کہ امیر جلال الدین اُس کے فرمان کی تعمیل کرے مگر اُس پر لشکر اجل کی چڑھائی ہو چکی تھی جیسی کہ سب پر ہوا کرتی ہے۔ اب جلال الدین دنیا میں تو آنے والا ہے نہیں کہ خدا کے بندوں کی خبر لے۔ میں نے آخرت میں بھی اُس سے امید قطع کی کیونکہ وہاں لوگوں کے استغاثے اُس کو میری طرف کا ہے کو متوجہ ہونے دیں گے۔

خواجہ علاء الدین نے فوراً اُس کی تلافی کی اور عذر چاہا۔ شیخ کی خانقاہ جہاں اب اُس کی قبر ہے یہ بھی صاحب دیوان کے روپیہ سے بنی تھی۔ اس کام کے لیے پچاس ہزار دینار اُس نے شیخ کو دیے تھے۔ شیخ نے ہر چند اُن کے لینے سے انکار کیا مگر صاحب دیوان نے بہ ہزار منت وسماجت اُس کو راضی کیا اور شیخ کی زندگی ہی میں اس رقم سے ایک عالیشان مدرسہ یا خانقاہ پہاڑ کے نیچے جو کہ گوشۂ شمال و مغرب میں شہر سے ملا ہوا ہے بنوائی گئی اور شیخ آخر عمر تک وہیں عزلت نشیں رہا۔

شیخ سے اکثر اہل علم حقائق و معارف کے دقائق و غوامض پوچھتے تھے اور وہ ہر ایک کا جواب تحریر یا تقریر میں دیتا تھا۔ از انجملہ علی بن احمد نے ایک قطعہ مولانا سعد الدین کا جو کہ علم و فضل کے سوا شاعری میں بھی مشاق و ماہر تھا نقل کیا ہے جس میں یہ استفسار کیا گیا ہے کہ سالک کی رہنما عقل ہے یا عشق۔ چونکہ اِس قطعہ سے اُس زمانہ کے علماء کی رائے شیخ کی نسبت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے اس لیے وہ قطعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ **قطعہ:**

سالکِ راہ خدا پادشہ ملک سخن | اے ز الفاظ تو آفاق پُر از دُرِیتیم
اختر سعدی و عالم ز فروغ تو منیر | واضع عقلی و گیتی ز نظیر تو عقیم

پیش اشعار تو شعر دگران را چہ محل — سحر بے وقع نماید بر اعجاز کلیم
بندہ را از تو سوالی است کہ توجیہ سوال — نکند مردم پاکیزہ سیر جز بہ کریم
مرد را راہ بحق عقل نماید یا عشق — این در بستہ تو بکشاے کہ بابیست عظیم
گرچہ این ہردو بیک شخص نیایند فرود — در دماغ و دل بیدار تو ہستند مقیم
پایۂ منصب ہریک از کرم باز نمائی — تا ز الفاظ خوشت تازہ شود جان سقیم
باد آسودہ وفارغ ز بد و نیک جہان — خاطر آئینہ کردار تو چون نفس حکیم

شیخ نے اُس کے جواب میں ایک طول طویل بحث نثر میں لکھی ہے جو اُس کے کلیات میں موجود ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شیراز میں جو شخص حاکم ہوتا تھا وہ شیخ کا نہایت ادب اور تعظیم اور اطاعت کرتا تھا۔ سردار انکیانو کو وہ برابر قصائد اور پندنامہ دغیرہ میں اِس طرح خطاب کرتا ہے جیسے بڑے اور بزرگ چھوٹوں کو کیا کرتے ہیں۔ اُس کے سوا ملک عادل شمس الدین جو کہ غالباً انکیانو کے بعد شیراز کا حاکم ہوا تھا وہ بھی حد سے زیادہ شیخ کی تعظیم اور عزت کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ شیراز میں فوج کے سپاہیوں اور افسروں نے چوری سے سرکاری کھجوریں جو زمین کے محصول میں زمینداروں سے وصول کی تھیں سبزی فروشوں کے ہاتھوں جبراً کسی وعدہ پر مہنگے نرخ سے بیچنی شروع کیں اور بہت سے بوجھ شیخ کے بھائی کی دوکان پر بھی جو کہ خاص بادشاہی ڈیوڑھی کے پاس بقالی کی دوکان کرتا تھا بھجوائے۔ شیخ اِس زمانہ میں حضرت ابوعبداللہ [1] ابن خفیف کی خانقاہ میں مجاور تھا۔ اُس کو بھی اِس واقعہ کی خبر پہنچی۔ اُس نے ملک شمس الدین کو جو کہ اِس حال سے بے خبر تھا ایک قطعہ لکھ بھیجا جس میں اہلِ فوج کی شکایت اور اپنے بھائی کی دوکانداری اور بے نوائی کا حال لکھا تھا۔ شمس الدین نے فوراً اُس کا تدارک کیا اور خود شیخ کے پاس آیا اور معافی چاہی اور ہزار درم پیش کر کے کہا کہ یہ حقیر رقم آپ کے بھائی کے خرچ کے لیے ہے اُس کو قبول کیجیے۔ شیخ نے لے کر بھائی کو بھیج دی۔

1۔ یہ بزرگوار چوتھی صدی ہجری کے اکابر صوفیہ میں سے ہیں جن کی نسبت خواجہ عبداللہ انصاری نے لکھا ہے کہ حقائق ومعارف میں کسی کی تصنیفات ابن خفیف کی برابر نہیں ہیں۔

شیخ کی وفات[1] شیراز میں جب کہ اتابکان فارس کے خاندان کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ولایت فارس خانان تاتار کی حکومت میں آ گئی تھی 691 ہجری میں واقع ہوئی ہے۔ کسی شاعر نے اُس کے مرنے کی تاریخ اِس طرح کہی ہے:

دُر بحر معارف شیخ سعدی — کہ در دریاے معنی بود غواص
مہ شوال روز جمعہ روحش — بدان درگاہ رفت ازروی اخلاص
یکے پرسید سالِ فوت گفتم — ز خاصان بود ازان تاریخ شد خاص

691ھ

شیخ کی عمر کسی نے ایک سو دو برس کی اور کسی نے ایک سو دس برس اور اکثر نے ایک سو بیس برس کی لکھی ہے۔ ہمارے نزدیک یہی پچھلا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ شیخ جیسا کہ بوستان کی ایک حکایت سے معلوم ہوتا ہے جوانی کے زمانہ میں شیراز سے باہر گیا اور بغداد میں اُس نے مدتوں امام ابن جوزی سے تحصیلِ علم کیا ہے۔ امام ابن جوزی کی وفات 597ھ میں ہو چکی تھی۔ اور شیخ کی وفات اُس سے 94 برس بعد واقع ہوئی پس اگر شیخ کی تمام عمر ایک سو دو برس کی سمجھی جائے تو لازم آتا ہے کہ شیخ زیادہ سے زیادہ نو برس کی عمر میں امام ابن جوزی سے تحصیلِ علم کر چکا تھا اور اگر ایک سو دس برس کی عمر قرار دی جائے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ سترہ برس کی عمر میں تحصیلِ علم سے فارغ ہو چکا تھا اور شیراز سے بچپن ہی کے زمانہ میں نکل گیا تھا۔ پس جس طرح پہلی بات خلافِ قیاس ہے اُسی طرح دوسری بات خلاف واقع ہے۔

سر گور اوسلی نے انگلستان کے ایک سیاح ولیم فرینکلن کے سفرنامہ سے جو کہ 1786ء میں فارس گیا تھا شیخ کے مدفن کا حال اِس طرح لکھا ہے کہ ''شیخ کا مزار مقام دلکشا سے ایک

1۔ سر گور اوسلی نے اُس کی وفات اتابک محمد شاہ ابن مظفر مظفرشاہ بن سعد زنگی کے عہد میں لکھی ہے۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ اتابک محمد شاہ 661ء تخت پر بیٹھا تھا اور آٹھ مہینے سلطنت کر کے مر گیا۔ پھر اُس کا بھائی سلجوق شاہ تخت نشیں ہوا اور 662ء میں قتل کیا گیا پھر سعد زنگی کی بیٹی آبش خاتون کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری ہوا اور 667ھ میں اُس کو معزول کر کے سلطان اباقاخان نے سردار انکیانو کو جو کہ شیخ کا ممدوح ہے حاکم فارس مقرر کیا۔ اب آگے کوئی متنفس اتابکان فارس کے خاندان کا حکمراں نہیں ہوا۔ پس شیخ کی وفات جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا خاندان اتابک کے زوال سے چوبیس برس بعد اور اتابک محمد شاہ کے عہد سے تیس برس بعد واقع ہوئی ہے۔

میل جانب شرق پہاڑ کے نیچے واقع ہے۔ عمارت اُس کی بہت بڑی اور مربع ہے اور قبر سنگین بنی ہوئی ہے۔ جس کا طول چھ فٹ اور عرض ڈھائی فٹ ہے۔ قبر کے تمام ضلعوں پر کچھ عبارت قدیم نسخ خط میں کندہ ہے جس میں شیخ کا اور اُس کی تصنیفات کا حال درج ہے۔ قبر ایک سیاہ رنگ کے چوبی قبر پوش سے جس پر سنہری کام ہو رہا ہے ڈھکی رہتی ہے اور اُس پر شیخ ہی کا ایک شعر خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ جب اِس قبر پوش کو ہٹاتے ہیں تو قبر کا تعویذ دِکھائی دیتا ہے۔ اکثر اہلِ اسلام جو اطراف و جوانب سے شیخ کے مزار پر آتے ہیں وہ پھول اور دیگر اقسام کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور زائرین کے مطالعہ کے لیے ایک نسخہ شیخ کے کلیات کا نہایت خوشخط لکھا ہوا مزار پر رکھا رہتا ہے۔ مقبرہ کی دیواروں پر بہت سے فارسی اشعار لکھے ہوئے ہیں جو لوگ دور دست مقامات سے وہاں زیارت کو آئے ہیں یہ اشعار اُنھوں نے لکھے ہیں۔ شیخ کے مقبرہ کی عمارت اب روز بروز گرتی جاتی ہے اور اگر اب اس کی خبر جلد نہ لی گئی تو بالکل کھنڈر ہو جائے گی۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ زمانہ کا عجیب انقلاب ہے کہ کسی شخص کو اُس کی مرمت کرانے کا خیال نہیں۔ اِس مقبرہ کے متصل اکثر دینداروں اور بزرگوں کے مزار ہیں جنھوں نے اپنی خواہش سے یہاں دفن ہونا چاہا ہے۔ اِس کے بعد سر گوراوسلی صاحب لکھتے ہیں کہ 1811ء کے شروع میں جب کہ میں جارج سوم بادشاہ انگلستان کی طرف سے بعنوان سفارت فتح علی شاہ قاچار کے پاس پیغام لے کر طہران کو جاتا تھا اُس وقت کئی مہینے شیراز میں میرا مقام رہا۔ جب تک میں وہاں رہا اکثر شیخ کے مزار پر جاتا تھا۔ مسٹر فرینکلن کے لکھنے کی تصدیق شیخ کے مزار پر جاکر ہوتی ہے۔ اُس کی قبر حقیقت میں بالکل بوسیدہ ہوگئی ہے اور تمام عمارت عنقریب منہدم ہوا چاہتی ہے۔ باغ اور درخت جو زمانہ سابق میں وہاں تھے اُن کا اب نام ونشان تک باقی نہیں رہا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر تھوڑا سا روپیہ خرچ کیا جائے تو اِس مقبرہ کی مرمت بخوبی ہو سکتی ہے اور میرے حسنِ عقیدت نے جو کہ میں شیخ اور اُس کے کلام کے ساتھ رکھتا تھا مجھ کو آمادہ کیا کہ اپنے پاس سے روپیہ صرف کر کے شیخ کے مقبرہ کی مرمت کرادوں۔ مگر شاہ ایران کا پانچواں بیٹا حسین علی مرزا جو اُس وقت فارس کا گورنر تھا اُس نے مجھ کو اس ارادہ سے باز رکھا اور نہایت سرگرمی سے کہا کہ میں اپنے روپیہ سے مزار کی مرمت کرادوں گا آپ کیوں اس قدر تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ میں شیخ

کے مزار کی مرمت اُسی خوبی اور اسلوب اور عمدگی سے کراؤں گا جیسے کریم خان زند نے خواجہ حافظ کے مزار کی کرائی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ اُس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔

نہایت تاسف کا مقام ہے کہ عنقریب وہاں کوئی نشان ایسا باقی نہ رہے گا جس سے معلوم ہو کہ وہ خطۂ ایران کا فخر جو زہد و تقویٰ اور ذہن و جودت اور علم و فضل میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا کہاں اور کس جگہ دفن ہوا ہے۔

سبحان اللہ کیا عبرت کا مقام ہے کہ ایک عیسائی مذہب زمین کے اُس کنارہ کا رہنے والا جہاں دنیا کی آبادی ختم ہوتی ہے باوجود اختلاف مذہب، اختلافِ قوم اور اختلافِ ملک کے ایک مسلمان مصنف کی ایسی قدر کرے کہ عالم سفر میں اُس کے مقبرہ کی مرمت کرانے پر آمادہ ہو اور اپنے پاس سے روپیہ خرچ کرنے کو موجود ہو۔ اور ایک مسلمان شاہزادہ سے باوجود اتحادِ زبان، اتحادِ مذہب، اتحادِ قوم و ملک کے ایسی بے قدری اور بے اعتنائی ظہور میں آئے۔

﴿فاعتبروا یا اولی الابصار﴾

دوسرا باب

شیخ کی تصنیفات

شیخ کی شاعری کی شہرت اُس کی زندگی میں

شیخ کی جادو بیانی اور فصاحت و بلاغت کا چرچا اُس کی زندگی ہی میں تمام ایران، ترکستان، تاتار اور ہندستان میں اِس قدر پھیل گیا تھا کہ اُس زمانے کی حالت پر لحاظ کرنے کے بعد اُس پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ خود شیخ بھی گلستان کے دیباچہ میں کہتا ہے ''ذکر جمیل سعدی کہ در افواہ عوام افتادہ وصیت سخنش کہ در بسیط زمین رفتہ'' شیراز اور کاشغر میں کچھ کم 16 سو میل کا فاصلہ ہے پہلے اس سے کہ شیخ کاشغر میں پہنچے وہاں کے چھوٹے بڑے اُس کے کمالات سے واقف تھے۔

جس زمانے میں شیخ کاشغر پہنچا ہے۔ غالبًا یہ وہ زمانہ ہے کہ چنگیز خان چینی تاتار کو خوارزمیوں سے فتح کر چکا ہے اور سلطان محمد خوارزم کے ساتھ چند روز کے لیے اُس کی صلح ہوگئی ہے۔ جب شیخ کاشغر کی جامع مسجد میں گیا تو وہاں ایک طالب علم مقدمۂ زمخشری [1] ہاتھ میں لیے زبان سے یہ کہہ رہا تھا کہ ''ضــرب زیدٌ عمــروًا'' شیخ اُس سے چُہل کی باتیں کرنے لگا اور کہا کیوں صاحب خوارزم و خطا میں صلح ہوگئی مگر زید اور عمرو کی خصومت بدستور چلی جاتی ہے۔ طالب علم ہنس پڑا اور شیخ کا وطن پوچھا۔ فرمایا خاک پاک شیراز۔ اُس نے کہا کچھ سعدی کا کلام یاد ہے؟ شیخ نے بطریق مزاح اُسی وقت دو عربی شعر کہہ کر پڑھے۔ اُس نے کسی قدر تامل کے بعد کہا سعدی کا زیادہ تر کلام فارسی ہے اگر کچھ اُس میں سے یاد ہو تو پڑھیے۔ آپ نے ویسے ہی دو فارسی شعر پڑھے جن میں سے ایک یہ ہے:

1۔ علامہ جار اللہ زمخشری صاحب تفسیر کشاف نے عربی زبان کی نحو میں ایک مختصر متن لکھا ہے اُس کا نام مقدمہ زمخشری ہے۔

شعر

اے دلِ عشاق بدام تو صید　　ما بتو مشغول و تو با عمر و زید

صبح کو جب شیخ نے کاشغر سے چلنے کا ارادہ کیا کسی نے اس طالب علم سے کہہ دیا کہ سعدی یہی شخص ہے۔ وہ بھاگا ہوا شیخ کے پاس چلا آیا اور نہایت افسوس کیا کہ پہلے سے آپ نے اپنا نام نہ بتایا کہ میں آپ کی خدمت گزاری سے سعادت حاصل کرتا۔ اگر اب بھی چند روز شہر میں چل کر قیام کیجیے تو ہم لوگ خدمت گزاری سے مستفید ہوں اس کے جواب میں آپ نے یہ اشعار پڑھے۔

اشعار

بزرگے دیدم اندر کوہسارے　　قناعت کردہ از دنیا بہ غارے

چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی　　کہ بارے بند از دل بر کشائی

بگفت آنجا پریدیان نغزند　　چو گل بسیار شد پیلان بلغزند

اسی طرح ملتان سے جو کہ شیراز سے چودہ سو میل ہے دو بار خان شہید سلطان محمد قاآن نے شیخ کی شہرت سن کر اُس کو وطن سے بلایا مگر وہ بڑھاپے کے سبب نہ آسکا۔

تبریز کے حمام میں جو شیخ اور مشہور شاعر ہمام [1] تبریزی کی نوک جھوک ہوئی ہے وہ نہایت مشہور قصہ ہے۔ جب تک ہمام نے یہ نہ جانا کہ یہ شخص سعدی ہے تب تک اُس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ سعدی شیرازی ہے فوراً نہایت شرمندگی سے عذر معذرت کر کے اپنے مکان پر لے گیا اور جب تک شیخ تبریز میں رہا کمال تعظیم اور ادب سے اس کی مہمانداری کی۔

سر گور اوسلی نے کتاب مجالس العشاق سے ایک حکایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکیم نزاری قہستانی (جو کہ خراسان کا ایک مشہور شاعر اور حکیمانہ مزاج آدمی تھا اور اسمعیلی مذہب رکھتا تھا) شیراز کے حمام میں شیخ سے ایک اجنبی صورت میں ملا۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص خراسان کا رہنے والا ہے شیخ نے پوچھا کہ سعدی کو کوئی خراسان میں جانتا ہے؟ کہا اُس کا کلام

1۔ خواجہ ہمام الدین باوجود نسبت باطنی اور کمالات علمی کے تبریز کے امرا میں سے تھا اور شاعری میں تمام معاصرین اُس کو مانتے تھے۔ محقق طوسی سے تحصیل علم کی تھی اور 713ھ میں وفات پائی۔

وہاں عموماً زبان زدِ خلایق ہے۔ اور پھر شیخ کی درخواست سے اُس کے چند اشعار پڑھے جن کو سن کر شیخ محظوظ ہوا اور سمجھا کہ یہ شخص شعر کا عمدہ مذاق رکھتا ہے۔ آخر دونوں پر ایک دوسرے کی حقیقت کھل گئی۔ شیخ نزاری کو اپنے مکان پر لے گیا۔ اور بہت دن تک اُس کو جانے نہ دیا اور بہت خوشی سے دل کھول کر اُس کی مہمانداری کی۔ حکیم نزاری نے وہاں سے رخصت ہوتے وقت اپنے نوکر سے کہا کہ اگر ہمارا میزبان کبھی خراسان میں آیا تو ہم اُس کو دکھائیں گے کہ مہمانوں کی تواضع اور مدارات کس طرح کیا کرتے ہیں۔ یہ جملہ شیخ کے کان تک بھی پہنچ گیا۔ اُس کو کمال افسوس ہوا اور یہ سمجھا کہ حکیم نے ہماری مہمانداری میں شاید کوئی قصور دیکھا۔ حسنِ اتفاق سے شیخ کا گزر قہستان میں ہوا اور حکیم نزاری سے ملاقات ہوئی۔ حکیم بہت محبت اور اخلاق سے پیش آیا مگر دعوت میں کچھ زیادہ تکلف نہیں کیا۔ پہلے روز جو کھانا دسترخوان پر آیا وہ محض رسمی اور سیدھا سادہ تھا۔ دوسرے وقت ایک بھُنے ہوئے تیتر کے سوا اور کچھ نہ تھا تیسرے وقت ایک گوشت کا اُبلا ہوا پارچہ اور خشکا تھا۔ چلتے وقت حکیم نے شیخ سے معافی چاہی اور کہا کہ جس طرح آپ نے میری ضیافت میں تکلفات کیے تھے اُس طرح سے مہمان آخر کو بارِ خاطر ہو جاتا ہے لیکن ہمارا طریقہ ایسا نہیں ہے شیخ کو اُس جملہ کا مطلب جو نزاری نے شیراز سے چلتے وقت کہا تھا اب معلوم ہوا۔

اِس حکایت سے شیخ کی شہرت اور بلند آوازگی کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہبی تعصبات سے مبرّا تھا۔ فرقہ اسمٰعیلیہ کے لوگ اُس زمانے میں عموماً ملحد اور بے دین سمجھے جاتے تھے اور کوئی فرقہ مسلمانوں میں کے نزدیک اسمٰعیلیوں سے زیادہ مبغوض اور مردود نہ تھا پس شیخ کی کمال بے تعصبی تھی کہ اُس نے ہمارے عہد کے مولویوں اور واعظوں کے برخلاف ایک غریب اسمٰعیلی کی اپنے وطن میں اس قدر خاطر اور مدارات کی اور خراسان میں خود اُس سے جا کر ملا اور اُس کا مہمان رہا۔ الغرض یہ حال شیخ کی شہرت کا خود اُس کے زمانے میں تھا اور اُس کے مرنے کے بعد جو عام قبولیت اُس کے کلام نے حاصل کی اُس کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔

شیخ کے کلام پر اور لوگوں کی رائیں

اکثر جلیل القدر شعرا نے شیخ کی نسبت ایسے اشعار کہے ہیں جن سے اُن کی اصلی رائے شیخ کے کلام کی نسبت ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے بہارستان میں کسی شاعر کا قطعہ نقل کیا ہے جس میں فردوسی کو مثنوی کا۔ انوری کو قصیدہ کا اور سعدی کو غزل کا پیمبر قرار دیا ہے اور وہ قطعہ یہ ہے:

قطعہ

در شعر سہ کس پیمبرانند   ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدۂ و غزل را   فردوسی و انوری و سعدی

نیز مولانا جامی نے نفحات الانس میں امیر خسرو دہلوی کی کثرتِ تصانیف اور جامعیت کے ذکر کے بعد شیخ کو باعتبار مقبولیت کلام کے امیر پر اِس پیرایہ میں ترجیح دی ہے کہ امیر نے بھی خضر کی ملاقات کے وقت یہ درخواست کی تھی کہ اپنا آبِ دہن اُس کے منھ میں ڈالے حضرت خضر نے فرمایا کہ یہ دولت سعدی کے نصیب کی تھی۔

حضرت امیر خسرو دہلوی نے بھی شیخ سعدی اور ہمام تبریزی کو اپنی مثنوی نہ سپہر میں غزل کا اُستاد مانا ہے لیکن دیگر اصنافِ سخن میں کنایتاً اپنے کو ترجیح دی ہے۔ مگر ایک اور شعر میں مطلقاً شیخ کے اتباع پر خود فخر کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

شعر

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت   شیرہ از میخانہ مستی کہ در شیراز بود

حضرت امیر حسن دہلوی نے بھی جن کو اس کے زمانے کے اہلِ مذاق سعدی ہندستان کہتے تھے شیخ کے تتبع پر افتخار کیا ہے وہ کہتے ہیں:

شعر

حسن گلے زگلستان سعدی آوردہ است   کہ اہل معنی گلچین ازین گلستان اند

خواجہ مجد الدین ہمگر جو کہ شیخ کا جلیل القدر معاصر ہے اُس سے چار نامی گرامی فاضلوں نے جن میں سے دو شخص علاوہ علم و فضل کے ہلاکو خان کے رکنِ سلطنت بھی تھے یعنی خواجہ شمس الدین صاحب دیوان، امیر معین الدین پروانہ حاکم روم، ملک افتخار الدین کرمانی اور ملا نورالدین صدری نے باتفاق ہم دگر ایک قطعہ مرتب کر کے مجد ہمگر کے پاس بھیجا تھا۔ جس میں امامی ہروی اور سعدی شیرازی کے کلام پر محاکمہ کی درخواست کی گئی تھی۔ اُس کے جواب میں مجد ہمگر نے یہ رباعی لکھ کر بھیجی۔

رباعی

ما گرچہ [1] بہ نطق طوطی خوش نفسیم بر شکر گفتہ ہائے سعدی مگسیم

در شیوۂ شاعری بہ اجماع امم ہرگز من و سعدی بہ امامی نہ رسیم

اِس رباعی میں اگرچہ ہمگر نے شیخ کو اپنے سے بہتر بتایا ہے مگر امامی کو اپنے اور شیخ دونوں پر ترجیح دی ہے۔

حاجی لطف علی خان آذر نے مذکورہ بالا حکایت پر جو کچھ لکھا ہے وہ ملاحظہ کے قابل ہے وہ لکھتا ہے کہ بعض مدعیانِ شعر نے مجد الدین ہمگر سے کہ بعنایت الٰہی پستی طبع میں آج اُن کا کوئی نظیر نہیں ہے سعدی اور امامی کی بابت محاکمہ چاہا تھا اُنھوں نے جواب میں یہ رباعی تحریر فرمائی۔ میں نے اس رباعی کو پڑھ کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ ہمارے زمانے میں ایسا اشتباہ کسی کو نہیں ہے (جیسا کہ محاکمہ چاہنے والوں کو تھا) اہلِ مذاق جانتے ہیں کہ ہمگر کی تحقیق کیسی پھسینڈی ہے۔ ہاں اُنھوں نے اپنی نسبت بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "میں امامی کے درجہ کو نہیں پہنچتا۔ بیشک امامی کا مرتبہ جناب صاحب رباعی سے بہت بالاتر ہے لیکن کسی طرح اُس کو شیخ بزرگوار سے نسبت نہیں ہے بلکہ تین شخصوں [2] کے سوا اور کسی کی مجال نہیں جو شیخ کی مساوات کا دم مار سکے۔ میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ جیسا ہمارا زمانہ دانشمندوں پر سخت گزرتا ہے ایسا زمانہ پہلے سخنوروں پر بھی گزرا ہے یا نہیں۔ جب یہ حکایت میری نظر سے گزری تو مجھ کو صبر آ گیا"۔

1۔ شیخ نے بھی اِس رباعی کو سن کر ایک رباعی لکھی ہے جو اس کے کلیات میں موجود ہے یعنی "ہر کس کہ بہ بارگاہ سامی نرسد از بخت سیاہ و بدکلامی نرسد ☆ ہمگر کہ بعمر خود نہ کردہ است نماز شک نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد"۔

2- شاید تین شخصوں سے مراد فردوسی، انوری اور نظامی ہیں۔

حاجی موصوف نے اِس مقام پر مجد ہمگر کی شان میں ایک قطعہ بھی لکھا ہے اور وہ یہ ہے:

قطعہ

یکے گفت ۔ امامی امام ہری را ز سعدی فزون یافتہ مجد ہمگر
درین ماجرا چیست رائے تو۔ گفتم ستمگر بود مجد ہمگر ستمگر

ہمارے نزدیک اگر مجد ہمگر اُس عصر میں جس میں سعدی اور امامی گزرے ہیں نہ ہوتا بلکہ سو پچاس برس بعد پیدا ہوتا تو اُس کو بھی شیخ اور امامی کے رتبے میں ہرگز یہ اشتباہ نہ ہوتا معاصرت نے لوگوں کے حالات پر اکثر ایسے پردے ڈالے ہیں مگر جس قدر اُن کا زمانہ گزرتا گیا اُسی قدر وہ پردے مرتفع ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ جو حق بات تھی وہ ظاہر ہوگئی۔ اصل یہ ہے کہ جب ایک زمانہ میں دو اہلِ کمال ہوتے ہیں تو ہر ایک کے ساتھ ایک ایک گروہ متعصبین کا کھڑا ہو جاتا ہے کیونکہ ہر شخص کے کچھ عزیز اور دوست اور کچھ اُن دوستوں کے دوست اور اسی طرح کچھ مخالف اور اُن مخالفوں کے دوست اور یگانے ضرور ہوتے ہیں اور اس طرح بڑھتے بڑھتے دو بڑے گروہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ طبقہ ختم ہو جاتا ہے اور اُن کے ساتھ کسی کو لاگ یا لگاؤ باقی نہیں رہتا تو جو ٹھیک بات ہوتی ہے وہ بغیر بحث و حجت کے خود بخود دلوں پر نقش ہو جاتی ہے۔ شیخ اور امامی کے عہد میں یہ کس کو معلوم تھا کہ عنقریب ایک کا کلام اطرافِ عالم میں پھیل جائے گا اور دوسرے کا نام صرف کتابوں میں لکھا رہ جائے گا۔

کلامِ شیخ کی مقبولیت کے ذکر میں اکثر یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ مشائخ وقت میں سے ایک بزرگ شیخ کے منکر تھے۔ ایک رات اُنھوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھولے گئے ہیں اور فرشتے نور کے طبق لے کر زمین پر نازل ہوئے ہیں۔ اُن بزرگ نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کہا سعدی شیرازی نے ایک بیت کہی ہے جو جناب الٰہی میں مقبول ہوئی یہ اِس بیت کا صلہ ہے اور وہ بیت یہ ہے:

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

جب وہ بزرگ خواب سے بیدار ہوئے تو رات ہی کو شیخ کے عزلت خانے پر یہ مژدہ سنانے کے لیے گئے۔ وہاں جا کر شیخ کو دیکھا کہ چراغ روشن کیے ہوئے جھوم جھوم کر یہ شعر پڑھ رہے ہیں شاید اِس حکایت کا مضمون بادی النظر میں مستبعد معلوم ہو۔ لیکن ہم کو اس میں

کوئی بات عقل یا نیچر کے خلاف نہیں معلوم ہوتی۔ خواب کا سچا ہونا اور اِن میں معمولی باتوں کا غیر معمولی طور پر نظر آنا ایک ایسا مسلّم امر ہے کہ آج کل کے فلسفی بھی اُس کا انکار نہیں کر سکتے اس کے علاوہ ہم اِس حکایت سے ہر حال میں یہ نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں کہ شیخ کے کلام کی مقبولیت اِس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ معمولی پیرائے اُس کے بیان کے لیے کافی نہ سمجھے جاتے تھے۔

اس حکایت کو اور زیادہ چمکانے کے لیے شیخ ابوالفیض فیضی کے مخالفوں نے ایک اور دلچسپ مضمون تراشا ہے۔ یعنی یہ کہ فیضی نے نلدمن کی توحید لکھتے وقت جب یہ شعر کہا:

شعر

در ہر بن مو کہ می نہی گوش — فوراۂ فیض اوست در جوش

تو اُس نے بھی ویسے ہی صلہ کی توقع میں جو شیخ سعدی کو ملا تھا آسمان کی طرف منہ کیا اتفاقاً ایک چیل نے اوپر سے پیخال کی جو فیضی کے منھ پر آ کر پڑی وہ بہت جھنجھلایا اور کہا: ''شعر فہمی عالم بالا معلوم شد'' ظاہرا یہ مضمون عبدالقادر بداونی کا جو کہ شیخ مبارک کے خاندان کا سخت دشمن ہے یا اُس کے کسی تتبع کا گھڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ''سعدی کے کلام کی لطافت اور بذلہ سنجی روما کے مشہور شاعر ہوریس کے کلام سے بہت ملتی ہے چونکہ سعدی کو لاطینی زبان آتی تھی اس لیے ظن غالب ہے کہ وہ ہوریس کے کلام سے مستفید ہوا ہوگا'' ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ قیاس کہاں تک صحیح ہے اور واقع میں شیخ کو لاطینی آتی تھی یا نہیں۔ ظاہرا یہ ویسا ہی قیاس ہے جیسا کہ دہلی کی جامع مسجد اور آگرہ کے روضہ تاج گنج کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں عمارتیں اٹلی کے کاریگروں نے بنائی ہیں۔ بات یہ ہے کہ جو قوم نہایت پستی کی حالت میں ہوتی ہے اگرچہ وہ کسی زمانہ میں کتنی ہی ترقی کر چکی ہو جس طرح اُس قوم کی موجودہ نسلیں ترقی یافتہ قوموں کی نظر میں حقیر اور ذلیل اور ہیچ و پوچ معلوم ہوتی ہیں اِسی طرح اُن کے اسلاف کی عظمت اور برتری کا بھی بہت کم یقین آتا ہے۔ اور اگر اُن کی کوئی ایسی بات پیش کی جاتی ہے جس کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا تو اُس کو مجبوراً کسی اور کی طرف منسوب کرنا پڑتا ہے۔

سر ولیم جونس جو کہ مشرقی زبانوں کا نہایت مشہور عالم ہے اُس نے جو شیخ اور اُس کے

کلام کی نسبت لکھا ہے وہ سرگوراوسلی نے نقل کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ سعدی نے تیرہویں صدی ہجری میں جب کہ اتابکان فارس وہاں کے اہلِ کمال کوتقویت دے رہے تھے اپنے جوہر دکھا نے شروع کیے تھے۔ حالانکہ اُس کی تقریباً تمام زندگی سفر میں گزری تھی باوجود اِس کے کہ کسی ایسے شخص نے بھی جس کو عمر بھر اطمینان اور فرصت حاصل رہی ہو اپنی عقل اور محنت کا نتیجہ شیخ سے بہتر نہیں چھوڑا''۔

انگلستان کے بعض اور مصنفوں نے اس کو مشرقی شکسپیر کہا ہے۔ اگر چہ یہ تشبیہ اُن مشرقی شاعروں کی نظر میں جو شکسپیر کی شاعری سے واقف نہیں ہیں کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ لیکن جب کہ یہ بات مسلّم ہے کہ انگریز شکسپیر کو تمام دنیا کے شاعروں سے بہتر سمجھتے ہیں تو دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ سعدی کو مشرق کا شکسپیر کہتے ہیں اُنھوں نے اُس کو کس درجہ کا شاعر تسلیم کیا ہے۔

شکسپیر کی شاعری اگر چہ سعدی کی شاعری سے بالکل مغائر ہے لیکن بعض حیثیات سے ایک کو دوسرے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ دونوں کے کلام میں عموماً یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ عقل و عادت کی سرحد سے تجاوز نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ نیچرل حالتوں کی تصویر کھینچتے ہیں دونوں کے کلام میں اکثر ظرافت اور شوخی کی چاشنی ہوتی ہے اور دونوں کا بیان ہمیشہ سادہ صاف اور دل نشیں ہوتا ہے۔ اِس کے سوا دونوں نے اکثر کلام کی بنیاد نصیحت اور پند پر رکھی ہے صرف فرق اس قدر ہے کہ شیخ کھلم کھلا نصیحت کرتا ہے اور شکسپیر کے پلے (یعنی ناٹک) سن کر کسی شخص کو یہ خیال نہیں گزرتا کہ یہ میرے ہم جنسوں کے عیب بیان ہو رہے ہیں یا کسی کو نصیحت کی جاتی ہے مگر اُس کا بیان اندر ہی اندر اپنا کام کرتا ہے بلکہ یہ گپتی منتر صریح نصیحت و پند سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ نیز دونوں کا کلام مقبول اور دل نشیں ہونے میں ایک دوسرے سے نہایت مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح شکسپیر کے صدہا اقوال انگریزی میں ضرب المثل ہو گئے ہیں اِسی طرح شیخ کی گلستان اور بوستان کے صدہا فقرے اور شعر اور مصرعے فارسی اور اردو میں ضرب المثل ہیں۔ اور اس سے دونوں کے کلام کی کمال خوبی اور حُسن اور یہ بات کہ اُنھوں نے جمہور کے دلوں پر کس قدر تسلط کیا ہے اور اُن کا کلام کس قدر انسان کی حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق واقع ہوا ہے ثابت ہوتی ہے اگر چہ اس کا زیادہ تر سبب یہ بھی ہے کہ ایشیا

میں جس قدر گلستان اور بوستان کی تعلیم و تعلم کا چرچا ہے ایسا کسی اور کتاب کا نہیں اور اسی طرح یورپ میں جس قدر شکسپیر کا کلام دائر و سائر ہے ایسا کسی اور شاعر کا کلام نہیں۔ پس ضرور ہے کہ دونوں کے اقوال سب سے زیادہ لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوں لیکن ظاہر ہے کہ جب تک کوئی کلام فی نفسہ مقبول اور دل نشیں ہونے کے قابل نہ ہو کسی طرح ممکن نہیں کہ اس طرح تمام ملک میں مشہور اور متداول ہو سکے۔

کلیاتِ شیخ

شیخ کا تمام کلام نظم، نثر، فارسی اور عربی جو اُس وقت متداول ہے اور جس کو شیخ علی بن احمد ابن ابی بکر نے شیخ کی وفات سے بیالیس برس بعد علی الترتیب جمع کیا ہے حسبِ تفصیل ذیل ہے۔

(1) نثر میں چند مختصر رسالے (جس میں سلوک اور تصوف کے مضامین اور مشائخ و عرفا کی حکایتیں اور ملوک و حکام کے لیے نصیحتیں لکھی ہیں) (2) گلستان (3) بوستان (4) پند نامہ (جس کو عرفِ عام میں کریما کہتے ہیں (5) قصائد فارسی (جن میں مرثیے، ملمعات، مثلثات اور ترجیعات بھی شامل ہیں (6) قصائد عربیہ (7) غزلیات کا پہلا دیوان موسوم بہ طیبات (8) دوسرا دیوان موسوم بہ بدائع (9) تیسرا دیوان موسوم بہ خواتیم (10) غزلیات قدیم جو غالباً عنفوانِ شباب کی لکھی ہوئی ہیں (11) مجموعہ موسوم بہ صاحبیہ جس میں شیخ نے قطعات، مثنویات، رباعیات اور مفردات کو خواجہ شمس الدین صاحب دیوان کی فرمایش سے ایک جگہ جمع کر دیا ہے (12) مطائبات و ہزلیات۔

اِن تمام کتابوں اور رسالوں میں سے مثنوی پند نامہ یعنی کریما کو بعض اہلِ مذاق شیخ کا کلام نہیں سمجھتے کیونکہ اول تو کلیات کے اکثر قدیم نسخوں میں یہ مثنوی نہیں دیکھی گئی دوسرے شیخ کے عام کلام میں جو پختگی اور جزالت یا دلفریبی اور جادو پایا جاتا ہے اُس سے یہ مثنوی معرّا ہے مگر ہمارے نزدیک اِس مثنوی کو شیخ کی طرف نسبت کرنے میں کوئی استبعاد اور تردد کی بات نہیں ہے یہ سچ ہے کہ وہ بوستان اور شیخ کی عام نظم کے مقابلے میں نہایت کم وزن معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ شاعر کا حال بالکل اِس شعر کا مصداق ہے:

شعر

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم ‌ ‌ ‌ گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

ایک ہی شاعر کا ایک کلام معجزہ معلوم ہوتا ہے اور دوسرا ہذیان اور یہی وہ خاصیت ہے جو خدا کے کلام کو بشر کے کلام سے جدا کرتی ہے کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ. لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوا فِیْهِ اِخْتِلَافاً کَثِیْراً کلیات کے بعض قدیم نسخوں میں اِس مثنوی کا نہ پایا جانا بھی اِس بات کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ وہ شیخ کا کلام نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ علی بن احمد کے بعد کسی کو یہ مثنوی ملی ہو اور اُس نے اس کو بھی کلیات میں داخل کر دیا ہو اور اِس سبب سے کلیات کے نسخوں میں اختلاف واقع ہو گیا ہو۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو کے کلیات میں اسی طرح نسخوں کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

بہر حال ہم جس طرح اِس مثنوی کے ثبوت کی کوئی قطعی دلیل نہیں سمجھتے اِسی طرح اس کی نفی کی بھی کوئی قوی وجہ نہیں پاتے۔

اب ہم شیخ کی بعض تصنیفات پر جو زیادہ مشہور ہیں یا زیادہ لحاظ کے قابل ہیں متوجہ ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہماری محدود واقفیت اور ناچیز رائے مساعدت کرے گی ہم اُن کی حقیقت ظاہر کرنے میں کوشش کریں گے ناظرین باتمکین سے یہ درخواست ہے کہ اگر کہیں ہماری رائے کی غلطی ظاہر ہو تو اُس کو متعصبانہ افراط وتفریط پر محمول نہ فرمائیں بلکہ اس کو ایک مقتضائے بشریت سمجھ کر اُسی قدر مواخذہ کے قابل ٹھہرائیں جس قدر کہ ایک غلط (مگر سچی رائے پر مواخذہ ہوسکتا ہے۔)

گلستان اور بوستان

اگر چہ ہر تصنیف وتالیف کی ماہیت اور اُن کے عیب وخوبیاں بیان کرنی عموماً مشکل ہیں لیکن جو کلام سب کے نزدیک مقبول ہو اور جس پر کسی نے خردہ گیری نہ کی ہو اُس پر ریویو لکھنا اور اُس کی خوبی یا عیب بیان کرنا حد سے زیادہ مشکل ہے۔ جس طرح بدیہیات پر استدلال کرنا نہایت دشوار ہے۔ اِسی طرح ایسے مقبول اور مسلّم کتابوں کے محاسن بیان کرنے

مشکل ہیں اور اُسی طرح اُن پر نکتہ چینی کرنی اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ ہم پہلا آسان کام کسی قدر اپنے ذمہ لیتے ہیں اور دوسرے مشکل کام کو اپنے سے زیادہ دقیقہ شناس اور باریک بیں لوگوں پر چھوڑتے ہیں۔

اِن دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا خاصہ اور لب لباب سمجھنا چاہیے۔ ظاہرا فارسی زبان میں کوئی کتاب اِن سے زیادہ مقبول اور مطبوع خاص و عام نہیں ہوئی۔ ایران، ترکستان، تاتار، افغانستان اور ہندستان میں اِن دونوں کتابوں کی تعلیم ساڑھے چھ سو برس سے برابر جاری ہے۔ بچپن میں اِن کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ اور بڑھاپے تک مطالعہ کا شوق رہتا ہے لاکھوں استادوں نے اِنھیں پڑھایا۔ اور کروڑوں شاگردوں نے انھیں پڑھا اِن کے بیشمار نسخے خوشنویسوں کے قلم سے لکھے گئے۔ اور بے انتہا اڈیشن لوہے اور پتھر پر چھاپے گئے۔ مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں میں اِن کے ترجمے ہوئے۔ مشائخ اور علماء نے ان کی عزت کی۔ بادشاہوں نے ان کو سلطنت کا دستور العمل بنایا۔ منشیوں اور شاعروں نے ان کی فصاحت اور بلاغت کے آگے سر جُھکایا اور اُن کے تتبع سے عاجز رہنے کا اقرار کیا اِن کا نام جس طرح ایشیا میں مشہور ہے اسی طرح یورپ میں بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔

اگرچہ یہ دونوں کتابیں حسن قبول، فصاحت، بلاغت، تہذیب اخلاق، پند و نصیحت اور اکثر خوبیوں کے لحاظ سے باہم دِگر ایسی مشابہت رکھتی ہیں کہ ایک کو دوسری پر ترجیح دینی مشکل ہے بلکہ اِن پر عربی کا یہ مقولہ صادق آتا ہے **احدھما افضل من الآخر** لیکن اگر بعض وجوہ سے گلستان کو بوستان پر ترجیح دی جائے تو کچھ بیجا نہیں ہے۔

فارسی نظم میں بوستان کے سوا اور بھی ایسی کتابیں موجود ہیں جو بوستان سے کم مقبول نہیں سمجھی گئیں بلکہ مثنوی معنوی اور شاہنامہ نے شاید اُس سے بھی بڑھ کر قبولیت حاصل کی ہے۔ لیکن فارسی نثر میں ظاہرا کوئی کتاب شیخ سے پہلے اور اُس کے بعد ایسی نہیں لکھی گئی جو گلستان کے برابر مقبول ہوئی ہو۔ سر گور اوسلی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سعدی کی گلستان کا ترجمہ جو کہ مشہور فاضل جنٹیس نے لاطینی میں کیا تھا اُس نے مدتوں یوروپ کے اہل علم و ادب کو شیخ کے خیالات پر فریفتہ رکھا ہے۔

تذکرۂ مجمع الفصحا جو کہ ابھی ایران میں تالیف ہوا ہے اُس میں یا کسی اور تذکرے میں لکھا ہے کہ فارسی نظم و نثر میں جس قدر چار کتابیں ایران میں مقبول ہوئی ہیں ایسی اور کوئی

کتاب نہیں ہوئی۔ شاہنامہ، مثنوی معنوی، گلستان اور دیوانِ حافظ۔

ہندستان میں بھی یہ چاروں کتابیں ایسی ہی مقبول ہوئی ہیں۔ جیسی ایران میں مگر سب کی شہرت اور قبولیت کے وجوہ مختلف ہیں۔ اگرچہ ایک خوبی یعنی بیان کی سادگی اور بے ساختگی میں چاروں کتابیں کم وبیش مشترک ہیں اور یہ وہ خوبی ہے جس کے بغیر کوئی کتاب مقبول نہیں ہوسکتی۔ لیکن صرف اس قدر خوبی سے کوئی کتاب ایسی شہرت اور قبولیت کے درجے کونہیں پہنچ سکتی جب تک اُس کے ساتھ کوئی اور دلکش اور دلفریب چیز نہ ہو کیونکہ نظم ونثر کی بیسیوں کتابیں جوتکلف اورتصنع سے بالکل پاک ہیں ایسی بھی ہیں جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

ہماری رائے میں گلستان کے سوا باقی تینوں کتابیں زیادہ تر اِس سبب سے مقبول ہوئی ہیں کہ وہ اپنی سادگی اور فصاحت و بلاغت کے علاوہ زمانے کے مذاق اور طبائع کے ساتھ بہت مناسبت رکھتی تھیں۔ سب سے اول شاہنامہ پرغور کرو۔ قطع نظر اس سے کہ قدیم زمانے کے حالات اور گزشتہ قوموں اور بادشاہوں کے محاربات انسان کو ہمیشہ بالطبع مرغوب ہوتے ہیں۔ جس زمانہ میں کہ شاہنامہ لکھا گیا اُس وقت وسط ایشیا کے مسلمانوں کوفتوحات اور لشکرکشی وکشورکشائی کا شوق حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اور شجاعت و بہادری کے مضمون اُن کودل سے پسند آتے تھے۔ پس ایک رزمیہ نظم کا جس میں رزم اور بہادری کے سوا اور مضمون بہت کم ہیں ایسے وقت میں لکھا جانا اُن کی حالت کے نہایت مناسب تھا۔ یہی سبب تھا کہ شاہنامہ ختم ہونے سے پہلے ہی اُس کی صدہا داستانیں کم وبیش لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوگئی تھیں۔ اور آخرکو اُس کا یہاں تک رواج ہوگیا تھا کہ بادشاہوں کے ہاں شاہنامہ خواں نوکر رکھے جاتے تھے۔ اور قہوہ خانوں میں جابجا گرمی صحبت کے لیے شاہنامہ پڑھا جاتا تھا۔ اِس کے سوا ہزاروں عجیب وغریب قصے جیسے سیمرغ کا زال کو پرورش کرنا۔ طہمورث دیو بند کا دیووں کا قید کرنا۔ جام جمشید کے کرشمے۔ رستم کا اپنے زور سے تنگ آکر اُس کوخدا کے پاس امانت رکھوانا اور پھر سُہراب کی لڑائی میں واپس لے لینا۔ اُس کا سیکڑوں دیوؤں کو مارنا اور مغلوب کرنا۔ اُس کے رخش کا شیروں کو ہلاک کرنا دِرّ بہمن کا طلسم ٹوٹنا اور اسی طرح کے ہزاروں افسانے مثل قصۂ امیرحمزہ اور بوستان خیال کے اُس میں درج تھے جوتمام دنیا کے آدمیوں کوعموماً اور ایشیا والوں کوخصوصاً ہمیشہ سے مرغوب رہے ہیں۔ اِن باتوں نے شاہنامہ کو اور بھی زیادہ مقبول اور عام پسند کردیا تھا۔

مولانا روم کی مثنوی اُس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب کہ ہمارے لٹریچر میں تصوف اور معرفت کا تسلط روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ شیخ محی الدین ابن العربی، شیخ صدرالدین قونوی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ علاء الدولہ سمنانی وغیرہم کی تصنیفات مذہب اور شاعری میں تصوف کی روح پھونک رہی تھیں شعر میں حقیقت اور معرفت کے مضامین تغزل کی نسبت زیادہ جی لبھانے لگے تھے۔ شیخ اکبر اور ابن فارض کے دیوانوں کے سامنے متنبی اور ابوتمام کی تشبیہیں بے مزا معلوم ہونے لگی تھیں۔ حدیقہ اور منطق الطیر نے رودکی اور عنصری کا کلام نظروں سے گرادیا تھا۔ ایسے وقت میں مثنوی معنوی کا جو کہ سراسر تصوف اور حقائق و معارف سے بھری ہوئی ہے مقبول ہونا ایسا ہی ضروری امر تھا جیسے غزنویہ اور سلاجقہ کے عہد میں شاہنامہ کا اور صفویہ کے عہد میں حملہ حیدری کا اس کے سوا مثنوی میں بھی صدہا عجیب وغریب قصے اور فوق العادۃ نقلیں اور تمثیلیں جو انسان کو بالطبع مرغوب ہیں درج تھیں اور اُن میں شریعت اور طریقت کے اسرار بیان کیے گئے تھے۔ پس مثنوی میں شعر اور تصوف کے علاوہ قصہ کا لطف اور مذہب کی عظمت بھی شامل تھی۔ یہی باعث ہے کہ مولانا روم کے حق میں ''نیست پیغمبر ولے دارد کتاب'' اور مثنوی کے حق میں ''ہست قرآن درزبانِ پہلوی'' کہا گیا ہے۔

خواجہ حافظ کے دیوان میں عشق و جوانی اور رندی اور شاہد بازی کے مضامین کے سوا جو کہ ہمیشہ سے دنیا میں مرغوب رہے ہیں اور انسان کے دل کو بزور اپنی طرف کھینچتے ہیں اور کوئی مضمون ہی نہ تھا۔ اور اس خیال نے کہ اُس میں عشق حقیقی کی واردات اور کیفیات عشق مجازی کے پیرایہ میں ادا کی گئی ہیں اُس کو اور بھی زیادہ دلچسپ اور دلربا کردیا تھا۔ پس اِن تینوں کتابوں کا اس قدر مقبول ہونا کچھ زیادہ تعجب کی بات نہ تھی۔

گلستان میں اِن وجوہ میں سے کوئی وجہ نہ تھی نہ اُس میں رزم تھی نہ عجیب وغریب افسانے تھے۔ نہ فوق العادۃ قصے، نہ حقائق و معارف، نہ شریعت کے اسرار، نہ طریقت کے نکات، نہ غزل عاشقانہ، نہ قولِ عارفانہ بلکہ اُس کی بنیاد محض اخلاق پند و موعظت پر رکھی گئی تھی جس سے زیادہ کوئی پھیکا اور بے نمک مضمون خاص کر فارسی لٹریچر میں نہیں پایا جاتا۔ پند و موعظت جب تک قصہ یا ناٹک کے پیرایہ میں نہ ادا کی جائے اکثر مخاطب کی وحشت اور تنفر کا باعث ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان کی طبیعت میں یہ بات ودیعت کی گئی ہے کہ وہ کھلی نصیحتوں سے متنفر اور چھپی نصیحتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ پس گلستان کا اس قدر مقبول ہونا سوا اس کے کہ

اُس کی فصاحت و بلاغت اور حُسنِ بیان اور لطف ادا کو تمام فارسی لٹریچر میں بے مثل اور لاجواب تسلیم کیا جائے اور کسی وجہ پر محمول نہیں ہوسکتا۔

گلستان کی عظمت اور بزرگی زیادہ تر اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر غیرزبانوں کا لباس اس کتاب کو پہنایا گیا ہے ایسا فارسی زبان کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔ خود شیخ ہی کے زمانہ میں گلستان کے اکثر قطعات و ابیات اس قدر مقبول اور زبانوں پر جاری ہوگئے تھے کہ اُس زمانہ کے فضلا اور اُدبا اُس کے اکثر اشعار عربی نظم میں ترجمہ کرکے اپنا زورِ طبع اور قدرتِ نظم دِکھاتے تھے۔ چنانچہ ادیب نامدار فضل اللہ بن عبداللہ شیرازی نے بھی جو کہ شیخ کے اخیر زمانہ میں تھا اپنی مشہور تاریخ وصّاف میں گلستان کے دو قطعوں کا ترجمہ عربی میں نظم کیا ہے جو کہ مع اصل قطعات کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

قطعہ سعدی

گِلے خوشبوئے در حمام روزے — رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گِلے ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گُل نشستم
جمالِ ہمنشین در من اثر کرد — وگر نہ من ہمان خاکم کہ ہستم

ترجمہ عربیہ

اِذا هو في الحمام طين مُطَيَّبٌ — توصَل مِنْ أيدي كريم الى يدى
فَقُلْتُ له هل أنت مشك و عنبرٌ — فَاِنّى مِنْ ريّاکَ سكران معتد
اَجابَ بِأنى كنتُ طيناً مُذلَّلاً — فَجالستُ للوردِ الجنى بمعهد
فأثر في خلقي كما مجالسي — و الاّ آنا الترابُ الذّي كنتُ في يد

قطعہ سعدی

گر خردمند ز اجلاف جفائے بیند — تا دلِ خویش نیازارد و درہم نشود
سنگِ بدگوہر اگر کاسۂ زرین بشکست — قیمتِ سنگ نیفزاید و زرکم نشود

ترجمہ عربیہ

اِنْ نـال نِـدٌ مِـن الاندالِ مَنْقَصَلةً　　　حـاشی له أن یلیب النفس بالصَخَر

فـالتِبرُ مِن حَجَرٍ اِذْ صَارَ مُنکسراً　　　فـالتبر تِبرٌ و مَا یَزْداد في الحَجَر

پھر ایک مدت کے بعد تمام گلستان کا ترجمہ جیسا کہ مشہور ہے عربی زبان میں ہوا جو کئی صدیوں تک عرب، شام، روم اور مصر میں متداول رہا اور حال میں مصر کے ایک ادیب نے جس کا نام جبریل ہے۔ اُس کا ایک اور نہایت فصیح عربی ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں چھپوایا ہے اس کے سوا استنبول کی ترکی میں بھی اُس کے متعدد ترجمے سُنے گئے ہیں۔ جن میں سب سے اخیر ترجمہ سلطان عبدالحمید خان کے بھائی اور ولی عہد رشاد پاشا نے حال ہی میں کیا ہے۔ یوروپ میں گلستان اور بوستان کے جس قدر ترجمے ہوئے ہیں اُن کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم ہونی مشکل ہے۔ مگر انگلش انسائیکلوپیڈیا میں کسی قدر ترجموں اور اڈیشنوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو 1852ء تک چھپے اور شایع ہوئے اُس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

گلستان کے ترجمے بوستان کی نسبت بہت زیادہ ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے جنٹس نے اصل گلستان معہ لاطینی ترجمہ اور کسی قدر حواشی کے امسٹرڈم میں چھپوائی۔ پھر ڈورائر نے جو کہ فرانس کی طرف سے اسکندریہ میں کانسل تھا فرنچ میں اس کا ترجمہ کیا جو کہ 1634ء میں بمقام پیرس چھپا۔ اُس کے بعد اصل کتاب سے گارڈین نے 1789ء میں اور سیمالیٹ نے 1834ء میں ترجمہ کیا۔ یہ دونوں ترجمے بھی فرنچ میں ہوئے تھے۔ جرمن زبان میں اولی ایریس کا ترجمہ زیادہ مشہور ہے وہ اُس کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ اس ترجمہ میں ایران کے ایک فاضل سے مدد لی گئی ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ میرے ترجمہ سے پہلے ڈورائر کے فرنچ ترجمہ سے ایک اور ترجمہ جرمن میں ہو چکا تھا۔ اولی ایریس کا ترجمہ نہایت ذی وقعت ہے اور اس میں جو تصویریں چھاپی گئی ہیں وہ بہت ہی عمدہ ہیں۔ یہ ترجمہ اوّل 1654ء میں بمقام سلیزوگ چھپا تھا اور اُسی سال جرمن سے ڈچ زبان میں ترجمہ ہو کر امسٹرڈم میں چھپا۔ اولی ایریس نے بوستان کا بھی ترجمہ جرمن میں کیا ہے۔ حال میں گلستان کا ایک اور ترجمہ کے۔ ایچ گراف نے جرمن میں کیا ہے جو 1846ء میں بمقام لیسبرگ چھپا ہے۔ اِسی مترجم نے بوستان کا بھی ترجمہ کیا ہے جس کا نام لسٹ گارٹن ہے اور جو 1850ء میں دو جلدوں میں چھپا

ہے انگریزی میں گلستان کا ترجمہ ایک تو گلیڈون نے کیا ہے جو بمقام لندن 1808ء میں چھپا۔دوسرا ترجمہ راس صاحب کا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے کیا گیا تھا۔ ایک اور ترجمہ ایسٹوک نے انگریزی میں کیا ہے نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں جو 1852ء میں بمقام ہرٹ فورڈ چھپا تھا۔ یہ ترجمہ نہایت عمدہ ہے۔ سعدی کی کلیات فارسی وعربی چھوٹی تقطیع کے کاغذ پر ہیرنگٹن نے 1791ء میں چھپوائی تھی۔ اور گلیڈون نے صرف گلستان 1806ء میں چھپوائی جو دوبارہ 1809 میں بمقام لندن مطبوع ہوئی۔ پھر 1807ء میں ڈیمولن نے گلستان معہ اپنے ترجمہ کے کلکتہ میں چھپوائی جو کہ اُس وقت سے اب تک کئی بار پتھر پر چھپ چکی ہے۔ پروفیسر فاکر نے فارسی خواں طلبہ کے لیے بوستان کا نہایت عمدہ انتخاب کر کے چھپوایا ہے جس میں تقریباً تہائی کتاب داخل ہے اور بعض حکایات کے ترجمے حواشی سمیت ایشیاٹک جرنل میں معہ متن کے چھاپے گئے ہیں۔ ڈاکٹر اے اسپرنگر نے 1851ء میں بمقام کلکتہ گلستان معہ اعراب اور علامات وقف کے چھپوائی تھی اور ایسٹوک نے بمقام ہرٹ فورڈ 1850ء میں اُس کو کئی قلمی نسخوں سے صحیح کر کے معہ فرہنگ کے شایع کیا۔

مذکورہ بالا ترجموں اور اڈیشنوں کے سوا جن کا ذکر انگلش انسائیکلوپیڈیا میں کیا گیا ہے اور بہت سے نئے ترجمے اور اڈیشن خصوصاً 1852ء کے بعد شایع ہوئے ہیں۔ ازانجملہ 1871ء میں جان پیسٹ انسپکٹر مدارس ممالک متوسط نے اصل گلستان معہ انگریزی فرہنگ کے حسن اہتمام اور صحت کے ساتھ لندن میں چھپوائی تھی۔ اور کپتان ولبرفورس کلارک نے بوستان کا انگریزی ترجمہ 1879ء میں کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ اُس نسخہ سے کیا گیا ہے جو جرمنی کی اورینٹل سوسائٹی میں 1851ء میں چھپا تھا۔ پھر حال ہی میں بوستان کی چیدہ حکایتوں کا ترجمہ میجر میکلن نے نظم میں کیا ہے جس کا نام **فلورز فروم دی بوستان** رکھا ہے۔

ہندستان میں بھی متعدد زبانوں میں گلستان کا ترجمہ ہوا ہے۔ ازانجملہ میر شیر علی افسوس تخلص نے مارکوئس ولزلی گورنر جنرل کے عہد میں اُس کا اُردو ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں لکھا ہے مگر چونکہ اُس وقت تک اُردو زبان خوب منجھ کر صاف نہ ہوئی تھی اِس لیے زمانہ حال کے ترجمے جو اُس کے بعد ہوئے ہیں زیادہ صاف اور بامحاورہ اور فصیح ہیں۔ بنگالی اور گجراتی میں بھی گلستان کے ترجمے ہوئے ہیں مگر اُن کا مفصل حال معلوم نہیں ہے۔ بھاشا میں اول شال

مغربی اضلاع میں گلستان کے آٹھویں باب کا ترجمہ کیا گیا تھا جس کی اشاعت کو تقریباً تمیں برس گزرے ہوں گے۔ اس ترجمہ کا نام مترجم نے پشپ باٹکا (یعنی باغ کی ایک کیاری) رکھا ہے۔ اس کے بعد ہمارے دوست پنڈت مہر چند داس مہاجن اگروال جینی مذہب متوطن قصبہ سونی پت ضلع دہلی نے حال ہی میں ساری گلستان کا ترجمہ نظم میں اور نثر کا نثر میں نہایت کوشش سے کیا ہے جو 1888ء میں چھپ کر شائع ہو گیا ہے۔ اس ترجمہ کا نام پشپ بن رکھا ہے جو کہ لفظ گلستان کا مرادف ہے۔ پنڈت صاحب نے پند نامۂ شیخ یعنی کریما بھی بھاشا ترجمہ چو پائی وزن کی نظم میں لکھا ہے جس کا نام شیکشا پتری ہے۔

ترجمہ کے علاوہ گلستان بلکہ بوستان کی بھی بہت سی شرحیں اور فرہنگیں لکھی گئی ہیں جن میں سے خان آرزو کی خیابان گلستان اور ٹیک چند کی بہار بوستان زیادہ مشہور ہیں۔ علی الخصوص گلستان کی قدر و منزلت ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے خیالات کے موافق کی ہے۔ جس طرح اہلِ علم نے مختلف زبانوں میں اُس کے ترجمے کیے ہیں اور شرحیں وغیرہ لکھی ہیں یا اہلِ تعلیم نے فارسی تعلیم کی بنیاد اس پر رکھی ہے یا منشیوں نے اُس کے فقرات و ابیات سے اپنے منشآت کو زینت دی ہے اسی طرح امرا نے اُس کے نسخے نہایت خوش خط لکھوا کر اُن کو مطلّی اور مذہّب کرایا ہے یہاں تک کہ ہمارے ملک کے رئیسوں نے بھی جو درس و کتاب سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اس کی حد سے زیادہ قدر کی ہے۔ بعضوں نے ایک ایک نسخہ کی تیاری اور تزئین میں لاکھ لاکھ روپیہ کے قریب صرف کیا ہے۔ اگرچہ ان باتوں کو کتاب کی اصلی عظمت اور خوبی سے کچھ تعلق نہیں ہے لیکن گلستان کی عام قبولیت پر اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ ہندستان کے رئیس اس کو اس قدر عزیز رکھیں۔ گویا اپنے گانے پر کبھی ایسا فخر نہیں کرتا جیسا اُس وقت کرتا ہے کہ ایک اناڑیوں کی مجلس میں جا پھنسے اور اُن کو محظوظ کر کے اُٹھے۔

گلستان کے ابواب کی عمدہ ترتیب، اُس کے فقروں کی برجستگی، اُس کے الفاظ کی شستگی، اُس کے استعارات کی جزالت، اُس کی تمثیلات وتشبیہات کی طُرفگی اور پھر باوجود ان تمام باتوں کے عبارت میں نہایت سادگی اور صفائی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ شیخ نے اپنی عمر عزیز کا ایک معتد بہ حصہ اُس کی تصنیف میں صرف کیا تھا اور اُس کی تنقیح وتہذیب میں اپنے فکر

اور سلیقہ سے پورا پورا کام لیا تھا۔ چنانچہ دیباچہ گلستان کے اخیر میں اُس نے صاف کہا ہے کہ ''برخے از عمر گرانمایہ بر وخرچ کردیم'' مگر دیباچہ ہی کی ایک اور عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس فصل بہار کے آغاز میں اُس کا لکھنا شروع ہوا تھا وہ ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کتاب تمام ہوگئی اور اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ شیخ نے گلستان چند مہینے سے زیادہ میں نہیں لکھی مگر یہ بالکل غلط ہے جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذت اور قبولیت پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ اُس کے ایک ایک لفظ میں مصنف کے خونِ جگر کی چاشنی نہ ہو۔ اور جس قدر اُس میں زیادہ صفائی اور گھلاوٹ پائی جائے اُسی قدر سمجھنا چاہیے کہ اُس کی درستی اور کاٹ چھانٹ میں زیادہ دیر لگی ہوگی۔ یورپ میں اکثر نامی مصنفوں کے مسودے بہم پہنچا کر نہایت احتیاط اور حفاظت سے رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ اٹلی کے شمالی حصہ میں جو دیزا ایک بستی ہے وہاں مشہور مصنف اریسٹو کے مسودے اب تک موجود ہیں۔ اُس مصنف کا کلام سادگی اور صفائی اور بے تکلفی میں مشہور ہے مگر اُس کے مسودے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو فقرے لوگوں کو نہایت پسند آتے ہیں اور حد سے زیادہ صاف ہیں وہ آٹھ آٹھ دفعہ کاٹے گئے ہیں۔ لارڈ مکالی جو انگلستان کا نہایت مشہور اور مقبول مصنف ہے اُس کا ایک مسودہ لندن موزیم میں رکھا ہے اس میں بھی جابجا کاٹ چھانس اور حک و اصلاح پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض فقرے دس دس دفعہ کاٹے گئے ہیں۔ ظاہراً شیخ نے جو گلستان کے دیباچہ میں فصل بہار کا ذکر کیا ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ گلستان کے لیے جو سرمایہ اُس نے سالہا سال میں جمع کیا تھا وہ پہلے اُس کے پاس نامرتب موجود تھا جب وطن میں پہنچا تو دوستوں کی تحریک سے اُس کو مرتب کردیا یہ ترتیب فصل بہار کے آغاز سے شروع ہوئی اور اُس کے تمام ہونے سے پہلے ختم ہوگئی گلستان اور نیز بوستان کی ترتیب جس سلیقہ سے شیخ نے کی ہے اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کو اس کام میں بہت وقت اُٹھانی پڑی ہوگی۔ اُس نے اِن کتابوں میں زیادہ تر وہ واقعات لکھے ہیں جو خود اُس پر گزرے ہیں یا اُس کے سامنے پیش آئے۔ اور ہر ایک باب کی تکمیل کے لیے کسی قدر حکایتیں ایسی بھی لکھی ہیں جو کسی سے سنیں یا کتابوں میں پڑھیں۔ اس تمام مجموعے کو گلستان میں آٹھ باب پر اور بوستان میں دس باب پر تقسیم کیا ہے اور ہر ایک باب میں اُس کے مناسب حکایتیں درج کی ہیں اور ظاہراً علم اخلاق کی کوئی فرع ایسی نہیں ہے جو

بقدر ضرورت اِن میں سے ہر ایک کتاب میں بیان نہ کی گئی ہو۔ یہ بات تقریباً ایسی ہی مشکل تھی جیسے کوئی شخص سیر و سیاحت کے واقعات ایسی ترتیب سے لکھے کہ اُس میں علم اخلاق کے ہر ایک باب کا مطلب اجمالاً یا تفصیلاً بقدر ضرورت آ جائے اِس ترتیب کی قدر اُس وقت معلوم ہو سکتی ہے کہ دونوں کتابوں کی اصل حکایتوں کو نا مرتب کر کے گڈمڈ کر دیا جائے اور ہر ایک حکایت سے جو نتیجے شیخ نے استخراج کیے ہیں وہ اُن میں درج نہ کیے جائیں اور پھر تمام مجموعۂ حکایت کو جدا جدا بابوں پر تقسیم کرایا جائے اور پوچھا جائے کہ وہ حکایت کون سے باب سے علاقہ رکھتی ہے اور یہ کون سے باب سے۔

جس طرح ہر ایک ملک میں لٹریچر کی ابتدا نظم سے ہوتی رہی ہے اسی طرح ایران میں بھی اول شاعری کا ظہور ہوا تھا۔ اور دوسری صدی کے اخیر سے جب کہ اول ہی اول خواجۂ عباس مروزی نے مامون کی مدح میں فارسی قصیدہ لکھا۔ کئی صدیوں تک مقتضائے وقت کے موافق صرف شاعری کو ترقی ہوتی رہی۔ فارسی نثر لکھنا اگرچہ ایک مدت کے بعد شروع ہو گیا لیکن شیخ کے زمانہ تک اُس کی کوئی عام شاہراہ مقرر نہیں ہوئی اکثر سیدھی سادی عبارت عام روزمرہ اور بول چال کے موافق لکھی جاتی تھی یا اہل علم کسی قدر خواص کے روزمرہ میں تحریر کرتے تھے چنانچہ حکیم ناصر خسرو کا سفرنامہ جو کہ پانچویں صدی میں لکھا گیا اس میں نہایت بے تکلفی سے خواص کی معمولی بول چال میں حالات تحریر کیے گئے ہیں۔ اور بعض ادیب و فاضل جن پر عربیت غالب تھی اُن کے قلم سے بغیر فکر اور غور کے اکثر عربی لغات اور اشعار وغیرہ فارسی تحریروں میں تراوش کرتے تھے۔ مگر نثر میں شاعرانہ شوخی اور جادو پیدا کرنا اور اُس کے فقروں میں ایک خاص قسم کے وزن اور تول کا لحاظ رکھنا جاری نہ ہوا تھا۔ خصوصاً کوئی اخلاقی کتاب عمدہ نثر میں شیخ کے زمانہ تک ایسی نہیں لکھی گئی تھی جس میں اخلاق کا بیان واقعات نفس الامری کے ضمن میں کیا گیا ہو۔ 551 ھ میں قاضی حمید الدین ابوبکر نے مقامات بدیعی اور مقامات حریری کی طرز پر فارسی میں مقامات حمیدی لکھی ہے اُس میں نہایت تکلف اور تصنع پایا جاتا ہے اُس کی بنیاد زیادہ تر صنائع لفظی پر رکھی ہے اور تمام کتاب بدیعی اور حریری کی طرح مقفیٰ اور مسجع لکھی ہے اور جس طرح اِن دونوں کتابوں میں فرضی قصے وضع کیے گئے ہیں اُسی طرح اُس میں بھی محض خیالی افسانے لکھتے ہیں جن میں گھٹانے بڑھانے اور ہر

قسم کے تصرف کرنے کا اختیار مصنف کے ہاتھ میں ہوتا ہے اِس کتاب کے پڑھنے سے کوئی خیال اس کے سوا دل میں پیدا نہیں ہوتا کہ مصنف کو عربی لغات پر بہت عبور تھا اور تجنیس و ترصیع اور دیگر صنائع لفظی کے برتنے پر کافی قدرت رکھتا تھا۔

ایک اور کتاب موسوم بہ قابوس نامہ پانچویں صدی ہجری کی تصنیف ہماری نظر سے گزری ہے جس کا مصنف قابوس [1] بن سکندر ملقب بہ عنصر المعالی ہے یہ تمام کتاب اخلاق اور آداب معاشرت میں لکھی گئی ہے اس کا بیان بہت صاف اور سادہ ہے اور مضامین عمدہ ہیں لیکن اس کے سوا کوئی ندرت یا دلفریبی اُس کی عبارت میں نہیں پائی جاتی۔

غرض کہ شیخ نے آنکھ کھول کر نثر کا کوئی ایسا عمدہ نمونہ نہیں دیکھا تھا جس کی نسبت یہ گمان کیا جائے کہ گلستان کی بنیاد اُس پر رکھی گئی ہوگی۔ حق یہ ہے کہ وہ خود ہی اِس روش کا موجد تھا اور اُسی پر اُس کا خاتمہ ہوگیا۔

اُس نے اپنی دونوں بے نظیر کتابوں میں برخلاف ایرانی نثاروں کے اپنی بلند پروازی اور نازک خیالی ظاہر کرنی یا اپنا تفلسف اور تبحر علمی جتانا یا عقل و عادت کے خلاف باتیں لکھ کر لوگوں کا دل لبھانا اور عجائبات کا طلسم باندھ کر خلقت کو حیرت میں ڈالنا نہیں چاہا۔ اُس نے دونوں کتابوں میں باستثنا چند حکایتوں کے کوئی واقعہ ایسا نہیں لکھا جو عقل یا عادت کے خلاف ہو یا جس کو سن کر کچھ زیادہ تعجب ہو۔ وہ اکثر اپنی آنکھ کی دیکھی یا کان سے سُنی یا کسی کتاب سے انتخاب کی ہوئی ایسی سیدھی سادی معمولی باتیں لکھتا ہے جو صبح سے شام تک ہر انسان پر گزرتی ہیں۔ عام حکایتیں جو اِن دونوں کتابوں میں درج ہیں وہ اِس قبیل کی ہیں کہ مثلاً ایک بدمعاش سائل نے اپنے کو قرضدار ظاہر کر کے ایک بزرگ سے دو دینار حاصل کیے۔ لوگوں نے کہا یہ تو مکار تھا۔ اس کو کچھ دینا نہ چاہیے تھا۔ فرمایا اگر مکار تھا تو میں اُس کے شر سے بچا ورنہ وہ اوروں کے شر سے بچا۔

یا یہ کہ ایک بادشاہزادہ کے تاج کا لعل اندھیری رات میں ایک پتھریلی جگہ گر پڑا بادشاہ نے بیٹے سے کہا کہ پتھریوں میں سے لعل پانا چاہتا ہے تو ہر پتھری کو لعل سمجھ کر غور سے دیکھ۔

1۔ یہ شخص دیار آل زیار میں سے ایک بادشاہ ہے جس نے جرجان اور گیلان وغیرہ میں اکیس برس حکمرانی کی ہے اور 462ھ میں وفات پائی۔

یا یہ کہ میں چند درویشوں کے ساتھ روم میں پہونچا اور ہم سب ایک ذی مقدور شیخ کے ہاں اُترے اُس نے ہماری ہر طرح سے خاطر کی مگر کھانے کو کچھ نہ دیا۔

اِن سیدھی سادی حکایتوں کو وہ ایسے لطیف اسلوب سے بیان کرتا ہے اور اُن سے ایسے پاکیزہ نتیجے استخراج کرتا ہے کہ ایک نہایت بے حقیقت بات حقیقت میں ایک نکتہ یا ایک دلچسپ قصہ معلوم ہوتا ہے۔

گلستان اور بوستان کو پڑھ کر دو باتوں میں سے ایک بات کا ضرور اقرار کرنا پڑتا ہے۔ یا تو یہ کہ انتخاب کرنے میں شیخ کا مذاق ایسا صحیح تھا کہ جو حکایت وہ اِن کتابوں میں درج کرنی چاہتا تھا اُس میں کوئی نہ کوئی لطیف اور چبھتی ہوئی بات ضرور ہوتی تھی اور یا یہ کہ وہ اپنی خوش سلیقگی اور حسن بیان سے ایک مبتذل اور پیش پا افتادہ مضمون کو بھی اُسی قدر دلآویز طور پر بیان کر سکتا تھا جیسے ایک نرالے اور اچھوتے خیال کو۔

تعجب ہے کہ شیخ کی گلستان آیندہ نسلوں کے لیے نثر فارسی کا ایک لاجواب نمونہ تھی۔ ایران میں اُس کے تتبع کا کسی نے خیال نہیں کیا یا یوں کہیے کہ کسی سے اُس کا تتبع نہیں ہو سکا۔ اگرچہ شیخ کے بعد نثر فارسی کی ترقی یا وسعت انتہا کے درجے کو پہنچ گئی اور نثر لکھنے پر ایسے ایسے جلیل القدر فاضلوں نے کمر باندھی جن کا علم وفضل شیخ سے بمراتب فائق تر تھا مگر سب کی ہمت زیادہ تر الفاظ اور صنائع لفظی پر مقصود رہی۔

ایران میں سب سے بڑا انشار فضل اللہ بن عبداللہ شیرازی سمجھا جاتا ہے جو شیخ کے اخیر زمانہ میں ہوا ہے اُس کی مشہور کتاب تاریخ وصّاف سے بیشک اُس کا کمالِ علمی اور عربی و فارسی دونوں زبانوں کی نظم ونثر پر بڑی قدرت معلوم ہوتی ہے لیکن ساری کتاب میں شاید ہی کوئی فقرہ ایسا نکلے جو متوسط درجہ کی استعداد کا آدمی ڈکشنری کھولے بغیر سمجھ سکے یا جس کا انداز بیان دل میں جا کر چُبھے 712ھ میں جب کہ سلطان محمد اولجایتو خان خدا بندہ کے حکم سے آذربیجان میں شہر سلطانیہ بن کر تیار ہو چکا اور اس خوشی میں سلطان کی طرف سے تمام شہر کی دعوت کی گئی۔ اس کتاب کی تقریب اور تعریف سلطان کے حضور میں کی گئی۔ سلطان نے اُس میں سے کچھ متفرق فقرے پڑھنے کا حکم دیا۔ اس وقت دربار میں وزیر رشید الدین اور قاضی القضاۃ نظام الدین عبد الملک اور خواجہ اصیل الدین طوسی اور بڑے بڑے عالم اور

فاضل موجود تھے فضل اللہ نے چند دعائیہ فقرے کہ اُن سے زیادہ سلیس اور آسان عبارت شاید تمام کتاب میں نہ ہوگی خاص سلطان کے سنانے کو لکھے تھے وہ پڑھنے شروع کیے سلطان ہر فقرہ کے معنی رشید الدین وغیرہم سے پوچھتا تھا یہ لوگ اُس کی شرح بہت بسط کے ساتھ کرتے تھے تب سلطان کی سمجھ میں کچھ آتا تھا یا شرمے شرمائے کچھ ہاں ہوں کر دیتا تھا۔ یہ حال تاریخ وصاف کی عبارت کا ہے اُس کے بعد بھی زیادہ تر نثر لکھنے والوں نے اسی بات میں کوشش کی ہے کہ اُن کی نثر کے سمجھنے میں ناظرین کو طرح طرح کی دقتیں پیش آئیں اور اُن کے علم و فضل اور ہمہ دانی کا اعتقاد دلوں میں پیدا ہو مگر یہ ارادہ بہت کم کیا گیا ہے کہ مفید خیالات زود فہم الفاظ اور دلآویز عبارت میں ادا کیے جائیں۔

تین کتابیں میری نظر سے گزری ہیں جو شیخ کے بعد گلستان کی طرز پر لکھی گئی ہیں۔ ایک مولانا عبدالرحمٰن جامی کی بہارستان، دوسری مجد الدین خوانی [1] کی خارستان، تیسری حبیب قاآنی [2] شیرازی کی پریشان سو اول ہم بہارستان کا ذکر کرتے ہیں۔ اگرچہ خارستان کو عبارت کی خوبی اور جزالت کے لحاظ سے بہارستان کے ساتھ کچھ نسبت نہیں ہے۔ بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو تو خارستان کا طریقۂ تحریر اکثر جگہ اہلِ زبان کی روش سے بیگانہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب دونوں کو گلستان کے مقابلہ میں لایا جاتا ہے تو جس طرح آفتاب کے سامنے چاند اور شمع دونوں کی روشنی کافور ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح بہارستان اور خارستان دونوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے اور ایک کو دوسرے سے بہتر کہنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ حکایتیں اور روایتیں جو اِن دونوں کتابوں میں درج کی گئی ہیں وہ فی الحقیقت گلستان کی حکایتوں سے بہت ملتی جلتی ہیں اور زیادہ تر مجد الدین خوانی نے اپنی کتاب کے ابواب بھی اُسی طریقہ پر مرتب کیے ہیں مگر شیخ کے حسن بیان اور لطف ادا سے گلستان نے ایک خاص صورت پیدا کی ہے جس کے سبب سے وہ بالکل انوکھی اور نرالی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ہرچند اس قسم کی ہم شکل

1۔ یہ شخص اکبر کے عہد میں خراسان سے آیا تھا۔ خواف خراسان میں ایک مشہور بستی ہے۔ کہتے ہیں کہ خارستان اس نے اکبر کے حکم سے لکھی تھی۔

2۔ یہ شخص زمانہ حال کا ایک نہایت مسلّم اور مقبول شاعر ہے جس کو اہلِ ایران خاتم الشعرا سمجھتے ہیں۔ اُس کی وفات کو چالیس برس سے زیادہ نہیں گزرے۔

اور ہم جنس کتابوں میں پورا پورا فرق اور امتیاز کرنا بغیر وجدان صحیح اور ذوق سلیم کے ممکن نہیں ہے۔ لیکن چند متحد المضمون فقروں کے مقابلہ کرنے سے کسی نہ کسی قدر اندازہ ہوسکتا ہے کہ کون سا اسلوب بیان زیادہ صاف اور پاکیزہ و دلآویز ہے اور کون سا کم اس لیے چند ایسی مثالیں جو نہایت دقت اور جستجو سے بہم پہنچی ہیں۔ اِس مقام پر نقل کی جاتی ہیں۔

گلستان اور بہارستان کا مقابلہ

گلستان: اسکندر را پرسیدند کہ دیارِ مغرب مشرق را بچہ گرفتی کہ ملوک پیشین را خزائن وعمر و ملک ولشکر بیش از تو بود و چنین فتحے میسر نشد۔ گفت بعونِ خداے عزوجل ہر مملکتے را کہ گرفتم رعیتش را نیازردم و رسوم خیراتِ گذشتگان باطل نہ کردم و نام بادشاہان جز بہ نکوئی نہ بردم۔

بیت

بزرگش نخوانند اہل خرد کہ نام بزرگان بزشتی برد

قطعہ

این ہمہ ہیچ است چون می بگذرد
بخت و تخت و امر ونہی گیرو دار
نام نیک رفتگان ضائع مکن
تا بماند نام نیکت یادگار

بہارستان: اسکندر را گفتند بچہ سبب یافتی آنچہ یافتی از دولت سلطنت ومملکت باصغر سن و حداثت عہد۔ گفت باستمالت دشمنان تا از غائلہ دشمنی زمام تافتند و از تعاہد دوستان تا در قاعدۂ دوستی استحکام یافتند۔

بیت

بایدت ملک سکندر چون وے از حسن سیر
دشمنان رادوست گردان دوستان رادوست تر

اِن دونوں عبارتوں میں باعتبار فصاحت و بلاغت کے جو فرق ہے اُس کا فیصلہ زیادہ تر ذوق صحیح پر منحصر ہے مگر جس قدر قیدِ بیان میں آسکتا ہے وہ لکھا جاتا ہے۔ لیکن اس سے محض گلستان کی فوقیت جتانی مقصود ہے نہ کہ بہارستان کی تنقیص کرنی۔ اوّل ''اسکندر را پرسیدند'' اور ''اسکندر را گفتند'' میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ سوال کے موقعہ پر پرسیدن بہ نسبت گفتن

کے زیادہ مناسب ہے۔ **دوسرے** شیخ کے ہاں خزائن وعمر و ملک ولشکر چار لفظ ایک دوسرے پر معطوف ہیں اور کوئی لفظ حشو و بیکار نہیں ہے۔ اور مولانا کے ہاں دولت سے اگر سلطنت مراد ہے تو سلطنت ومملکت دونوں ورنہ صرف لفظِ مملکت حشو ہے اور صغرِ سن کے بعد حداثت عہد بھی حشو ہے۔ **تیسرے** شیخ کے ہاں بیان میں سوال کرنے کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ باوجود کمی لشکر و ملک وعمر و مال کے مشرق ومغرب کو فتح کرنا تعجب سے خالی نہ تھا۔ اور مولانا کے ہاں سوال کی وجہ ایسی ظاہر نہیں ہے کیونکہ تھوڑی عمر میں بہتیرے لوگوں نے دولت اور سلطنت حاصل کی ہے۔ **چوتھے** سکندر کا جواب جو شیخ نے نقل کیا ہے اُس میں ہرگز اس سے زیادہ اختصار کی گنجایش نہ تھی ورنہ سکندر کا جواب ناتمام رہتا۔ اور جو جواب مولانا نے نقل کیا ہے وہ اِن لفظوں میں ادا ہوسکتا تھا۔ ''بہ استمالتِ دشمنان وتعاہدِ دوستان'' اِس سے زیادہ بیان کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ **پانچویں** شیخ نے جو نتیجہ حکایت کے مضمون سے نکال کر اشعار میں بیان کیا ہے وہ کئی وجہ سے مولانا کے نتیجہ کی نسبت زیادہ بلیغ ہے۔ شیخ کا نتیجہ لازمی ہے۔ اور مولانا کا نتیجہ غیر لازمی۔ کیوں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص دشمنوں کو دوست اور دوستوں کو زیادہ دوست بنائے گا اُس کو ضرور سکندر کی سی سلطنت حاصل ہو جائے گی۔ اِس کے سوا مولانا نے حقیقت میں کوئی نتیجہ نہیں نکالا بلکہ حکایت کا خلاصہ ایک بیت میں دوبارہ بیان کر دیا ہے۔ اور شیخ نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ ایک اچھوتا مضمون ہے کہ جب تک بیان نہ کیا جاوے ہر شخص کا ذہن وہاں تک انتقال نہیں کرسکتا۔ نیز شیخ نے ایسا حاوی نتیجہ نکالا ہے جو تمام مخلوق کو شامل ہے۔ کیونکہ سلف کی تعظیم اور ادب اور اُن کے محاسن وکمالات کی قدر کرنی ہر شخص کے حق میں مثمر برکات ہے اور مولانا کا نتیجہ صرف سلاطین الوالعزم کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ ملک سکندر کی خواہش اُن کے سوا اور کسی کو نہیں ہوتی۔

گلستان:	**بہارستان:**
رازیکہ نہاں خواہی با کسے درمیان منہ اگرچہ دوست باشد کہ مرآن دوست را نیز دوستان باشند ہمچنیں۔	اسرارِ نہان خود را با ہیچ دوستی درمیان منہ زیرا کہ بسیار بود کہ در دوستی خلل اُفتد و بدشمنی بدل گردد۔

مسلسل قطعہ

خامشی بہ کہ ضمیرِ دلِ خویش
با کسے گفتن و گفتن کہ مگوئے
اے سلیم آب زسر چشمہ بہ بند
کہ چوں پُرشد نتوان بستن جوئے

بیت

سخنے در خلا نباید گفت
کان سخن برملا نشاید گفت

قطعہ

اے پسر سرّ ے کش از دشمن نہفتن لازمست
بہ کہ از افشائے آن با دوستی کم دم زنی
دیدہ ام بسیار کز سیر سپہرِ کج نہاد
دوستاں دشمن شوند و دوستیہا دشمنی

قطعہ

بر سرِ سر بمہر کہ افتد بخاطرت
سرعت مکن بہ موج بیانش نگاشتن
ترسم شود غرامتِ اظہارِ آن ترا
مشکل تراز ندامتِ پوشیدہ داشتن

اِس مثال میں بھی گلستان کا بیان بہارستان کی نسبت چند وجوہ سے زیادہ بلیغ ہے۔ (1) شیخ کہتا ہے ''راز یکہ نہان خواہی'' یعنی جس بھید کو چھپانا منظور ہو اُسے کسی سے نہ کہو۔ اور مولانا کہتے ہیں ''اسرارِ نہان خودرا''۔ یعنی اپنے پوشیدہ بھیدوں کو ظاہر نہ کرو۔ حالانکہ بعضے بھید کیسے ہی پوشیدہ ہوں ایک مدت کے بعد کہنے کے لائق ہو جاتے ہیں مگر جن کا چھپانا منظور ہوتا ہے وہ کبھی کہنے کے لائق نہیں ہوتے۔ (2) شیخ کہتا ہے ''باکس درمیان منہ اگر چہ دوست باشد'' اور مولانا کہتے ہیں ''بہ ہیچ دوستی درمیان منہ'' پہلے بیان میں دوست اور غیر دوست سب سے راز کہنے کی ممانعت ہے مگر دوسرا بیان جب تک اس طرح نہ ہو ''بادوست ہم درمیان منہ'' تب تک اُس میں تعمیم پیدا نہیں ہوتی۔ (3) شیخ نے راز نہ کہنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اُس کے بھی دوست ہوں گے اور اُن دوستوں کے بھی دوست ہوں گے اور یہ سلسلہ اِس طرح چلا جائے گا۔ پس چپکے ہی چپکے راز جمہور میں پھیل جائے گا۔ مولانا نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ شاید دوستی میں خلل آجائے اور دوست دشمن ہو جائے اگر چہ مطلب دونوں صحیح ہیں لیکن پہلی وجہ زیادہ موجہ ہے کیونکہ یقیناً کوئی شخص دوستوں سے خالی نہیں ہوتا اور دوستی میں فرق آجانا کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ (4) شیخ کا قطعہ بلاغت میں مولانا کے قطعہ سے بمراتب افضل اور فائق تر ہے۔ پہلی بیت میں اُس نے انسان کی ایک ایسی غامض اور دقیق

خصلت کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام نظروں سے مخفی ہے وہ کہتا ہے:

خامُشی بہ کہ ضمیرِ دلِ خویش　　　با کسے گفتن و گفتن کہ مگوے

یعنی کسی سے اپنا بھید کہہ کر اُس کو افشائے راز سے منع کرنا کچھ مفید نہیں ہے کیونکہ انسان ممنوعات پر زیادہ حریص ہوتا ہے اس لیے اب اُس کو ضبط راز کرنا اور بھی مشکل ہوگا۔ پس اِس سے خامُشی ہی بہتر ہے۔ دوسری بیت میں ایک نہایت لطیف اور واضح مثال سے مطلب کو خاطر خواہ دلنشیں کیا ہے۔ مولانا کے قطعہ میں کوئی خوبی اِس مضمون کے سوا نہیں ہے کہ جو راز دشمن سے چھپانا چاہیے اُسے دوست سے بھی چھپانا چاہیے۔ مگر آن کے ساتھ لفظ افشا زائد معلوم ہوتا ہے کیونکہ ''ازان دم نزنی'' کہ جگہ ''از افشائے آن دم نزنی'' کہا گیا ہے اور قطعہ کا اخیر مصرعہ بھی حشو یا تکرار سے خالی نہیں ہے۔ دوستوں کا دشمن ہو جانا اور دوستی کا دشمنی ہو جانا فی الحقیقت ایک ہی بات ہے۔ (5) قطعہ کے بعد شیخ نے ایک فرد لکھی ہے جو فی الواقعہ سہل و ممتنع ہے۔ یعنی۔

سخنے در خلا نباید گفت　　　کان سخن برملا نشاید گفت

یہ دھوکا اکثر اشخاص کو ہو جاتا ہے کہ جب صحبت میں کوئی غیر جنس نہیں ہوتا تو ناگفتنی باتیں کہنے لگتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تخلیے میں گفتگو کر رہے ہیں اس سے اغیار مطلع نہیں ہو سکتے حالانکہ وہ باتیں ضرور رفتہ رفتہ منتشر ہو جاتی ہیں۔ اِس مجرب اور سچے مضمون کو جو کسی قدر دقیق بھی تھا ایسے صاف طور سے بیان کیا ہے کہ اُس سے زیادہ بیان کی صفائی ممکن نہیں۔ پھر خلا اور ملا اور در اور بر کا مقابلہ اور صنعت ذوقافیتین اُس کے علاوہ ہے۔ مولانا نے کوئی فرد نہیں لکھی مگر ایک دوسرا قطعہ لکھا ہے یعنی ''ہر سِرِّ سر بمہر کہ اُفتد بخاطرت الخ'' اس میں پہلے مصرعہ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جو راز سر بستہ تیرے خیال یا دل میں گزرے اور مطلب یہ ہے کہ جو بھید تیرے دل میں موجود یا مستور ہو پھر ''بموج بیانش نگاشتن'' کا لفظ ''اظہار آن'' کی جگہ لایا گیا ہے جس میں نہایت تکلف ہے۔ پھر اخیر مصرعہ میں ندامت کا لفظ شاید بے محل ہے کیونکہ اخفائے راز سے کبھی ندامت نہیں ہوتی۔ باوجود اِن تمام باتوں کے دونوں مثالوں میں

شیخ کے ہاں کوئی لفظ غریب یا غیر مانوس نہیں معلوم ہوتا اور مولانا کے ہاں اکثر الفاظ بمقابلہ گلستان کے الفاظ کے غریب معلوم ہوتے ہیں جیسے حداثتِ عہد، غائلہ، تعاہد، بموج بیانش نگاشتن، غرامت۔

گلستان اور خارستان کا مقابلہ

گلستان: حکیمان دیر دیر خورند و عابدان نیم سیر۔ و زاہدان تا سدّ رمق۔ و جوانان تا طبق برگیرند۔ و پیران تا عرق کنند۔ لمّا قلندران چندان خورند کہ در معدہ جائے نفس نماند و بر سفرہ روزی کس۔

بیت

اسیر بند شکم را دو شب نگیرد خواب
شبے زمعدۂ سنگی شبے ز دلتنگی

خارستان: ہر کہ در گرسنگی طاقت نیارد باید کہ سہ یک شکم را از طعام پُر کند و سہ یک دیگر از آب و سہ یک دیگر از برائے نفس زدن رہا کند۔ امّا صوفیان وقتِ ما میگویند کہ تو ہمہ شکم را از طعام پُر کن آب خود چیز لطیف ست خود را جائے میکند کہ لطیفان را جائے کم نباشد و نفس را جائے گو مباش۔

بیت

بشنو کہ چہ گفت صوفیِ پرواری
چون سیر شدی چرا غمِ جان داری

مثال دوم

گلستان: عالم ناپرہیزگار کور مشعلہ دارست یُھدٰی بہ و ھو لا یھتدی.

بیت

بیفائدہ ہر کہ عمر درباخت
چیزے نخرید و زر بینداخت

خارستان: علم با عمل ہمچو طعام با نمک ست ہر کرا ہر دو ہست حکمتے تمام دارد و طعام بے نمک را چہ توان کرد۔

بیت

عمل بے علم نا مضبوط باشد
ہمیشہ شرط با مشروط باشد

مذکورہ بالا مثالوں کو دیکھ کر غالباً ہر شخص جو فارسی زبان سے فی الجملہ آشنا ہے بخوبی اندازہ

کرسکتا ہے کہ خارستان کی عبارت گلستان کے مقابلے میں کس قدر کم وزن اور بے وقعت ہے اسی لیے ہم اس مقام کو ناظرین کے مذاق اور تمیز پر چھوڑ دیتے ہیں اور زیادہ نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں دیکھتے۔

پریشان کا مصنف مرزا حبیب قاآنی کتاب مذکور کے خاتمہ کے اشعار میں تصریح کرتا ہے کہ اُس کی عمر تیس برس سے بھی دو تین برس کم تھی جب یہ کتاب اُس نے لکھی ہے۔ اور شیخ نے گلستان کو سنِ کہولت اور اوائل سن شیخوخت میں مرتب کیا ہے۔ پس اگر قاآنی سے گلستان کا پورا پورا تتبع نہ ہو سکا تو کچھ تعجب نہیں کیونکہ ایک ایسی کتاب کا سرانجام کرنا جس کی بنا محض حکمت اور تجربت پر ہونی چاہیے شیخ کے مقابلے میں ایک نوجوان ناتجربہ کار کی طاقت سے باہر تھا۔ بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو تو بڑی عمر میں قاآنی سے گلستان کا جواب اتنا بھی لکھا جانا مشکل تھا کیونکہ اُس کی تمام عمر قصیدہ گوئی میں صرف ہوئی ہے جس میں محض خیالی ڈھکوسلے باندھنے اور الفاظ تراشی کے سوا حقیقت اور واقفیت سے کچھ غرض نہیں ہوتی پس جس قدر قصیدہ گوئی میں اُس کو مشق و مہارت زیادہ بڑھتی تھی اُسی قدر بیان حقائق اور واقعہ نگاری کا ملکہ اُس سے سلب ہوتا جاتا تھا۔ قاآنی نے بھی گلستان کی طرح پریشان کی عبارت دلچسپ اور دلآویز کرنے میں بہت کوشش کی ہے مگر سوا اِس کے کہ تمام کتاب کو ہزل اور فحش سے بھر دیا اور چند آزاد اور بیباک نوجوانوں کی ضیافتِ طبع کا سامان مہیا کر دیا اور کچھ اُس سے نہیں ہو سکا۔ خاتمہ کتاب کے سوا جس میں اُس نے ابنائے ملوک کے لیے چند پند کر کے کچھ نصیحتیں لکھی ہیں تمام کتاب میں وہ حکایتوں کی بنیاد اکثر نہایت غلیظ فحش یا نحیف ہزل پر رکھتا ہے جس کے پڑھنے سے شرم آتی ہے اور طرہ یہ کہ پھر اُس سے نتائج عارفانہ اور متصوفانہ استخراج کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ پریشان کا خاتمہ جس میں شوخی و ظرافت کا کچھ سامان نہیں ہے بابِ ہشتم گلستان کے مقابلے میں نہایت پھیکا اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ تمام خاتمے میں شاذ و نادر ہی کوئی مضمون ایسا ہوگا جس میں کوئی ندرت پائی جائے۔ عبارت بیشک عمدہ ہے مگر شیخ کی جادو بیانی کا کہیں نشان نہیں پایا جاتا۔ عام نصائح جو خاتمے میں درج ہیں وہ اِس قبیل کے ہیں: پند بادشاہ باید بہ سخن سخن چینان اعتماد نکند۔ پند بادشاہ باید دین را توقیر کند و دشمنان دین را تحقیر فرماید۔ پند بادشاہ باید از خدا غافل نماند تا خدا ے از و غافل نباشد۔ پند بادشاہان را در نظام ممالک دست دُرافشان بکار ست و تیغ سرافشان۔

بیت

''تا کہ بدان دوستان شوند فراہم　　　تا کہ بدین دشمنان شوند پریشان''

اور اگر کہیں عبارت میں اس سے زیادہ حسن پیدا کرنا چاہتا ہے وہاں حقیقت سے دور جا پڑتا ہے۔ مثلاً پند بادشاہ باید تواضع کند وتکبر نفرماید کہ تواضع صفتِ اتقیاست وتکبر صفتِ اشقیا۔ ومن گفتہ ام اہل تکبر را در نطفہ غش ست چوسرکشی صفت آتش ست وشیطان از آتش ست واہلِ تواضع را نطفہ پاکست چہ افتادگی صفت خاکست وآدم از خاک بود۔ اِس پند کے پہلے حصّے میں ظاہر ہے کہ کوئی اچھوتا مضمون نہیں ہے اور دوسرے حصّے میں جو اُس نے کچھ ندرت پیدا کرنی چاہی ہے وہ محض ایک شاعرانہ خیال ہے اور وہ بھی اچھی طرح بیان نہیں ہوسکا۔ اسی مضمون کو شیخ علیہ الرحمۃ نے بوستان میں اس طرح بیان کیا ہے۔

زخاک آفریدت خداوند پاک　　　پس اے بندہ اُفتادگی کن چو خاک
حریص و جہان سوز و سرکش مباش　　　زخاک آفریدندت آتش مباش
چو گردن کشید آتش ہولناک　　　بہ بیچارگی تن بینداخت خاک
چو آن سرفرازی نمود این کمی　　　ازان دیو کردند ازین آدمی

البتہ جو عذر کہ قاآنی نے پریشان کے دیباچے میں کیا ہے اور گلستان کے مقابلے میں کتاب لکھنے سے اپنا عذر ظاہر کیا ہے اُس سے اُس کا نہایت انصاف اور گلستان کی قدر شناسی ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے احباب کے نہایت سخت جبر سے پریشان کے لکھنے پر قلم اُٹھایا تھا۔ وہ لکھتا ہے ''کہ ایک نہایت عزیز دوست نے اصرار کیا کہ گلستان کی طرز پر نظم ونثر میں ایک کتاب لکھنی چاہیے۔ میں نے کہا۔ بھائی توبہ کر! میں! اور شیخ کی طرز پر کتاب لکھنے کا ارادہ کروں؟ مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کرکے کذاب کے سوا اور کچھ خطاب نہیں پایا میں نے مانا کہ جگنورات کو چمکتا ہے لیکن کیا وہ چاندنی کی برابری کرسکتا ہے؟ شیخ کی گلستان ایک باغ ہے جس کے ہر پھول کی پتی کے ہزاروں بہشت غلام ہیں اور اہل معنی کی جان قیامت تک اس کی حیات بخش خوشبو سے زندہ ہے۔ آخر جب اس نے نہ مانا اور میرے انکار سے اُس کا اصرار بڑھتا گیا تو مجبوراً کچھ نظم ونثر اور جدّ وہزل ترتیب دی گئی اور یہ سمجھا گیا کہ اگرچہ چڑیا پرواز میں شہباز کی برابری نہیں کرسکتی لیکن

اس کو بھی چار و نا چار اُڑ نا ہی پڑتا ہے۔

اب ہم چند ایسے فقرے گلستان اور پریشان سے انتخاب کر کے لکھتے ہیں جو متحد المضمون ہیں۔

گلستان اور پریشان کا مقابلہ

گلستان : اے فرزند دخل آب روانست و خرج آسیاے گردان۔ یعنی خرج فراوان کردن مسلّم کسے راست کہ دخلے معیّن دارد

قطعہ

چو دخلت نیست خرج آہستہ تر کن
کہ میگویند ملاحان سرودے
اگر باران بکوہستان نبارد
بسالے دجلہ گردد خشک رودے

پریشان : دخل سرچشمہ ایست و مخارج جوے چند کہ آب سرچشمہ در آنہا جاری است و لاشک چون سرچشمہ مسدود شود جوہا خشک شود پس ہر کس آب در جو جاری خواہد سرچشمہ را رعایت کند۔

ایضاً۔ خرج باندازہ دخل باید کرد نہ آنکہ خرج معلوم باشد و دخل موہوم چہ این معنی نامعقول است کہ بار در پیش قدم باشد و بارگیر در حیز عدم باشد

قطعہ

الا اے آنکہ حاجت ست موجود
بکارت می نیاید دخل معدوم
شنیدستی کسے از بہر جولان
نشیند بر فراز اسپ موہوم

اِس مثال میں گلستان سے صرف ایک عبارت اور پریشان کے دو مختلف مقامات سے دو عبارتیں ایک ہی مضمون کی نقل کی گئی ہیں مگر شیخ کا بیان قاآنی کی دونوں عبارتوں سے زیادہ بلیغ ہے لیکن جو فرق بہت باریک اور نازک ہیں اُن کا بیان کرنا اول تو مشکل ہے۔ دوسرے

یہ امید نہیں کہ ناظرین اُس کو غور سے دیکھیں گے۔ اسی لیے صرف ایسے فرق بتائے جاتے ہیں جو زیادہ روشن اور صاف ہیں۔ شیخ کے بیان میں مخاطب کو فرزند کے ساتھ تعبیر کرنا عین بمقتضائے مقام ہے۔ ایک تو اظہار شفقت جو ناصح کے لیے ضرور ہے۔ دوسرے یہ جتانا کہ نوجوان بھی اکثر اس نصیحت کے محتاج ہوتے ہیں۔ پھر دخل و خرج کی تشبیہ آبِ روان اور پن چکّی کے ساتھ کیسی عمدہ تشبیہ ہے کہ جس قدر نرالی ہے اُسی قدر چچی تلی بھی ہے۔ پن چکّی بھی بدون آبِ روان کے نہیں چلتی اور خرچ بھی بغیر آمدنی کے نہیں چلتا۔ پن چکّی بھی پانی کے بند ہو جانے پر کسی عارضی قوت سے نہیں چلائی جاتی ہے تو اُس کی گردش عارضی اور بے ثبات ہوتی ہے۔ خرچ بھی جو بدون آمدنی کے اندوختہ وغیرہ سے چلتا ہے بے بنیاد اور ناپائدار ہوتا ہے پھر اس تمام مطلب کو جو کہ ہم نے تشبیہ کے معنی سمجھانے کے لیے لکھا ہے۔ شیخ نے اِن مختصر اور جامع لفظوں میں ادا کیا ہے ''یعنی خرج فراوان کردن مسلّم کسے راست کہ دخلے معین دارد'' اس کے بعد قطعہ میں ایک نہایت بدیہی مثال دے کر بے بنیاد خرچ کا مآل ہر شخص کو آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا ہے اور اُس مقولے کو ملاحوں کی طرف منسوب کر کے یہ جتایا ہے کہ یہ ایسی بدیہی بات ہے کہ دجلے کے کنارے پر ہمیشہ ملاحی گیتوں میں گائی جاتی ہے۔ قاآنی نے آمدنی کو منبع سے اور اخراجات کو ندیوں سے تشبیہ دی ہے تشبیہ یہ بھی عمدہ ہے مگر یہ شیخ کی اُس تمثیل سے ماخوذ ہے جو اُس نے قطعے میں بیان کی ہے لیکن چونکہ یہ تمثیل نہایت موٹی اور معمولی تھی اس لیے شیخ نے اُس کو ملاحوں کی طرف منسوب کیا ہے اور قاآنی کو یہ بات نہیں سوجھی۔ پھر قاآنی کے بیان سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ سرچشمے کے بند ہوتے ہی ندیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ اور شیخ کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر مدت کے بعد خشک ہوتی ہیں اور فی الواقع ایسا ہی ہوتا ہے جیسا شیخ نے لکھا ہے پھر شیخ نے منبع کے بند ہو جانے کو قدرتی اسباب یعنی امساکِ باراں کی طرف مستند کیا ہے اور یہ کہا ہے ''واگر باران کوہستان نبارد'' اور قاآنی کہتا ہے کہ جو شخص ندی جاری رکھنی چاہے وہ سرچشمے کی خبر رکھے یعنی اُس کو بند نہ ہونے دے حالانکہ یہ امر انسان کی طاقت سے باہر ہے پھر قاآنی نے تمثیل سے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ جو شخص ندی کا جاری رکھنا چاہے وہ سرچشمے کی خبر رکھے۔ اگرچہ مطلب اِس سے بھی مفہوم ہو جاتا ہے لیکن اِس جگہ مقتضائے مقام کے موافق اُس کو یہ کہنا چاہیے تا کہ جو شخص ہمیشہ اپنا خرچ جاری رکھنا چاہے

اُس کو آمدنی پر نظر رکھنی چاہیے کیونکہ تمثیل اِسی مطلب کے سمجھانے کو دی گئی ہے نہ اِس بات کے سمجھانے کو کہ اگر ندی میں پانی جاری رکھنا چاہو تو سرچشمے کی خبر رکھو۔ دوسری عبارت کو قاآنی نے اِس جملے سے شروع کیا ہے ''خرج باندازہ دخل باید کرد'' اس کے بعد وہ کہتا ہے ''نہ آنکہ خرج معلوم باشد و دخل موہوم'' یہ دوسرا جملہ اُس نے مقتضائے مقام کے موافق نہیں بلکہ اپنی حالت کے موافق لکھا ہے کیونکہ سنا گیا ہے کہ وہ اکثر جشن وعید وغیرہ کے موقعوں پر دخل موہوم یعنی قصائد کے صلے کی توقع پر قرض لے کر خرچ کر لیا کرتا تھا ورنہ مقتضائے مقام یہ ہونا چاہیے تھا ''نہ آنکہ دخل اندک باشد و خرج بسیار'' یا ''نہ آنکہ دخل پنج باشد و خرج دہ'' یا اور اسی مضمون کا کوئی جملہ ہوتا کیونکہ آمدنی کے موافق خرچ کرنے کا مفہوم مخالف یہی مضمون ہوسکتا ہے۔ اس کے سوا وہ مضمون فی نفسہٖ صحیح بھی نہیں ہے کیونکہ دخل موہوم کی امید پر خرچ کرنا خاص خاص صورتوں کے سوا کسی کے نزدیک مذموم نہیں ہے۔ تمام تاجر اور کاشتکار اور مدبرانِ ملک دخل موہوم ہی کے بھروسے پر لکھوکھا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ پھر ایسے خرچ کو جو دخل موہوم کی اُمید پر کیا جائے موہوم یا معدوم گھوڑے پر سوار ہونے سے کچھ مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ معدوم گھوڑے پر بے شک کوئی سوار نہیں ہوسکتا لیکن دخل موہوم کی امید پر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہزاروں آدمی خرچ کرسکتے اور کرتے ہیں۔

گلستان: خشم بیش از حد گرفتن وحشت آرد و لطفِ بیوقت ہیبت ببرد نہ چندان درشتی کن کہ از تو سیر گردند و نہ چندان نرمی کہ بر تو دلیر

ابیات

درشتی و نرمی بہم در بہ ست
چو رگ زن کہ جرّاح و مرہم نہ ست
درشتی نگیرد خردمند پیش
نہ سستی کہ نازل کند قدرِ خویش

پریشان: کسانیکہ ظرافت و شوخی بسیار کنند یا بغایت رقیق القلب و وسیع الخلق باشند سرداری و سالاری لشکر را نشایند۔ چہ این صفت موجبِ جسارتِ لشکریان شود و گاہ باشد کہ ہر چہ گوید بہ ظرافت و شوخی حمل کنند و نیز اندک مہربانی و وسعتِ خلق لازم ست کہ لشکریان را بیم خستن و بستن نباشد، دور نیست کہ از بیم چشم و گوش

نظم

جوانے با پدر گفت اے خردمند
مرا تعلیم کن پیرانہ یک پند
بگفتا نیکمردی کن نہ چندان
کہ گردد چیرہ گرگ تیز دندان

حقوقِ بادشاہ فراموش کنند و در مخالفت ہم زبان شوند و در وقت کار سستی کنند تا کار فاسد شود۔

مثنوی

کسے را کہ شد حکمران بر سپاہ
دو خصلت ہمی داشت باید نگاہ
عتابے نہان اندرو صد خطاب
خطابے نہان اندر و صد عتاب
بہر نوش او نیش ہا جان گداز
بہر نیش او نوشہا دلنواز
بیکدست شمشیر زہراب دار
بیکدست دریای گوہر نثار

اس مثال میں گلستان اور پریشان کے مضمون میں کسی قدر فرق ہے۔ گلستان میں کسی خاص گروہ کی تخصیص نہیں ہے اور پریشان میں لشکر کے افسروں اور سپہ سالاروں کی تخصیص ہے اس لیے پورا پورا مقابلہ نہیں ہوسکتا لیکن چونکہ نفس مضمون متحد ہے اس واسطے کچھ کچھ پہلو مقابلے کے نکل سکتے ہیں۔ شیخ کا بیان لفظاً و معناً قاآنی کے بیان سے بمراتب فائق تر ہے۔ اول تو شیخ کے فقروں میں ایک خاص قسم کا وزن اور تول ہے۔ جو قاآنی کے فقروں میں نہیں ہے نثر میں ایسا تناسب بشرطیکہ معنی مقصود اور فصاحت و بلاغت میں کچھ فرق نہ آئے پرلے درجے کا کمال انشاپردازی اور اعلیٰ سے اعلیٰ رتبے کی شاعری ہے۔ شیخ کے چاروں فقروں میں الفاظ متقابلہ ایسی خوبی سے واقع ہوئے ہیں کہ معنی مقصود کو اُن سے اور زیادہ رونق ہوگئی ہے یعنی خشم اور لطف، بیش از حد اور بیوقت، وحشت اور ہیبت، آرد اور بیرد، درشتی اور نرمی کو جو فصاد کی حالت سے تمثیل دی ہے وہ کیسی بلیغ ہے اور کس قدر مختصر لفظوں میں ادا کی گئی ہے اور دوسری بیت میں کتنا وسیع مضمون دو مصرعوں میں بیان کیا ہے یعنی یہ کہ درشتی کو اپنا شعار بنالینا اور کبھی نرمی نہ برتنا جیسا کہ لفظ پیش گرفتن سے مستفاد ہوتا ہے اچھا نہیں ہے کیونکہ عقلمند ایسا نہیں

کرتے اور بالکل نرمی ہی نرمی برتنا اور کبھی درشتی نہ کرنا جیسا کہ سستی کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہے یہ بھی اچھا نہیں ہے کیونکہ اس سے انسان نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے پھر دوسری نظم میں صرف اتنی سی بات کہ نیکی بے محل کرنی نہیں چاہیے کیسے عمدہ پیرایے میں بیان کیا ہے۔ خصوصاً چنداں کا قافیہ متناسب اور ہم وزن لانے کے لیے کس مطلب کو کن لفظوں میں ادا کیا ہے۔ قاآنی کی نثر میں بمقابلہ شیخ کی نثر کے کوئی بات جو قابل ذکر ہو نہیں پائی جاتی۔ اور نظم میں بھی حقیقت اور معنی کی نسبت الفاظ کی چمک دمک زیادہ ہے۔ چونکہ دونوں عبارتوں میں فرق بیّن معلوم ہوتا ہے اس لیے پریشان کی عبارت میں زیادہ نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

اب ہم اِن اضافی خوبیوں کا بیان چھوڑ کر گلستان کے ذاتی محاسن کی طرف پھر متوجہ ہوتے ہیں۔ اِس کتاب کی عمدہ خاصیتوں میں سے ایک یہ خاصیت بھی فارسی لٹریچر میں نہایت عجیب اور قابلِ لحاظ ہے کہ فارسی اور اُردو کی تحریر و تقریر میں جس قدر گلستان کے جملے اور اشعار اور مصرعے ضرب المثل ہیں اور کسی کتاب کے نہیں دیکھے گئے۔ اُن میں سے کسی قدر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

1 ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است

2 ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت

3 حاجت مشاطہ نیست روی دلآرام را

4 ہر چہ بقامت کہتر بقیمت بہتر

5 ہر کہ دست از جان بشوید ہر چہ در دل دارد بگوید

6 دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند

7 سر چشمہ شاید گرفتن بہ میل
چوں پُر شد نشاید گذشتن بہ پیل

8 پرتوِ نیکان نگیرد ہر کہ بنیادش بد است

9 افعی راکشتن و بچہ اش را نگاہ داشتن کارِ خردمندان نیست

10 پسر نوح با بدان بنشست
خاندانِ نبوتش گم شد

11 دشمن نتوان حقیر و بیچارہ شمرد

12 عاقبت گرگ زادہ گرگ شود

13 در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

14 توانگری بہ دل ست نہ بمال و بزرگی بعقل ست نہ بسال۔

15 دشمن چہ کند چومہربان باشد دوست

16 حسود را چکنم کوزخود برنج درست

17 قدرِ عافیت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید

18 آنانکہ غنی ترند محتاج ترند

19 چوعضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار

20 دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم

21 گاہے بسلامے برنجند وگاہے
بدشنامے خلعت دہند

22 ہر کجا چشمۂ بود شیرین
مردم ومرغ ومور گرد آیند

23 راستی موجب رضائے خداست
کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

24 آنرا کہ حساب پاکست از محاسبہ چہ باک

25 تو پاک باش برادر مدار از کس باک
زنند جامۂ ناپاک گازران بر سنگ

26 تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ
مردہ شود

27 بہ دریا در منافع بیشمار ست
وگر خواہی سلامت بر کنار ست

28 دوست آن باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشان حالی و درماندگی

29 درِ میر و وزیر و سلطان را
بے وسیلت مگرد پیرامن
سگ و دربان چو یافتند غریب
این گریبان بگیرد آن دامن

30 خدائے راست مسلّم بزرگی والطاف
کہ جرم بیند و نان برقرار میدارد

31 بنیادِ ظلم اوّل در جہان اندک بود ہر کہ
آمد بران مزید کرد تا بدین غایت رسید

32 ہر کہ با فولاد بازو پنجہ کرد
ساعد سیمین خود را رنجہ کرد

33 چو کردی با کلوخ انداز پیکار
سر خود را بنادانی شکستی
چو سنگ انداختی بر روئے دشمن
حذر کن کاندر آماجش نشستی

34 کس نیاموخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

35 دریاب کنون کہ نعمت ہست بدست
کین دولت و ملک میرود دست بدست

36 گر وزیر از خدا بترسیدے
ہمچنان کز مَلِک مَلَک بودے

37 برگردن او بماند و بر ما بگذاشت

38 اگر شه روز را گوید شب است این

باید گفت اینک ماه و پروین

39 جهاندیده بسیار گوید دروغ

40 چو کارے بے فضولِ من بر آید

مرا در وے سخن گفتن نشاید

41 اگر روزی بدانش بر فزودے

ز نادان تنگ تر روزی نبودے

42 محتسب را درونِ خانہ چہ کار

43 ہر کہ عیبِ دگران پیش تو آورد و شمرد

بیگمان عیبِ تو پیشِ دگران خواہد برد

44 یارِ شاطرم نہ بارِ خاطر

45 چو از قومے یکے بیدانشی کرد

نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

46 من آنم کہ من دانم

47 گہے بر طارم اعلیٰ نشینم

گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

48 فہم سخن گر نکند مستمع قوتِ طبع از متکلم مجوی

49 خانہ دوستان بروب و در دشمنان مکوب

50 درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

51 نیک باشی و بدت گوید خلق بہ کہ

بد باشی و نیکت گویند

52 اگر دنیا نباشد دردمندیم

وگر باشد بمہرش پائے بندیم

53 درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست

54 پائے در زنجیر پیش دوستان بہ کہ

با بیگانگان در بوستان

55 زن بد در سرائے مرد نکو

ہم درین عالم است دوزخ او

56 کوفتہ را نان تہی کوفتہ است

57 او خویشتن گم است کرا رہبری کند

58 باطل است انچہ مدعی گوید

59 مرد باید کہ گیرد اندر گوش

ور نوشتہ ست پند بر دیوار

60 خاک شو پیش از انکہ خاک شوی

61 اگر خاکی نباشد آدمی نیست

62 ہمراہ اگر شتاب کند ہمراہ تو نیست

63 خوے بد در طبیعتے کہ نشست

نرود جز بوقتِ مرگ از دست

64 حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر ست

رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

65 خوردن برائے زیستن و ذکر کردن ست

تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن ست

66 نہ چندان بخور کز دہانت برآید
نہ چندانکہ از ضعف جانت برآید

67 عطاے او بہ لقاے او بخشیدم

68 ہر کہ نان از عملِ خویش خورد
منتِ حاتمِ طائی نبرد

69 گربۂ مسکین اگر پر داشتے
تخم کنجشک از جہان برداشتے

70 مور ہمان بہ کہ نباشد پرش

71 گفت چشم تنگ دنیا دار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

72 منعم بکوہ ودشت وبیابان غریب نیست

73 شاہد آنجا کہ رود عزت وحرمت بیند
ور برانند بقہرش پدر و مادر خویش

74 بہ از روے زیباست آواز خوش۔ کہ
این حظِ نفس ست وآن قوتِ روح

75 رزق ہرچند بیگمان برسد
شرطِ عقل ست جستن از درہا

76 بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند

77 مورچگان را چو بود اتفاق
شیر ژیان را بدرانند پوست

78 صیاد نہ ہر بار شکارے ببرد
باشد کہ یکے روز پلنگش بدرد

79 گاہ باشد کہ کودکے نادان
بغلط بر ہدف زند تیرے

80 گردنِ بے طمع بلند بود

81 این شکم بے ہنر پیچ پیچ
صبر ندارد کہ بسازد بہ ہیچ

82 یکے نقصانِ مایہ ودوم شماتتِ ہمسایہ

83 اگر از ہردو جانب جاہلانند
اگر زنجیر باشد بگسلانند

84 مرا بخیر تو اُمید نیست بد مرسان

85 تو براوجِ فلک چہ دانی چیست
چون ندانی کہ درسراے تو کیست

86 گر تو قرآن بدین نمط خوانی
ببری رونقِ مسلمانی

87 چشم بداندیش کہ برکندہ باد
عیب نماید ہنرش درنظر

88 نکوئی با بدان کردن چنانست
کہ بد کردن بجاے نیکمردان

89 سر مانداری سر خویش گیر

90 ناز بران کن کہ خریدار تست

91 خطاے بزرگان گرفتن خطاست

92 چون تخبت شد اعتدال مزاج
نہ عزیمت اثر کند نہ علاج

93 زنِ جوان را اگر تیرے در پہلو نشیند
بہ کہ پیرے

94 تو بجاے پدر چہ کردی خیر
تا ہمان چشم داری از پسرت

95 اسپ تازی دوتگ رود بشتاب
اُشتر آہستہ میرود شب و روز

96 خر عیسیٰ اگر بمکہ رود
چون بیاید ہنوز خر باشد

97 میراث پدر خواہی علم پدر آموز

98 اگر صد عیب دارد مرد درویش
رفیقانش یکے از صد ندانند
وگر یک ناپسند آید ز سلطان
ز اقلیمے بہ اقلیمے رسانند

99 ہر کہ در خردیش ادب نکنند
در بزرگی فلاح ازو برخاست

100 ہر آن طفل کو جور آموزگار
نہ بیند جفا بیند از روزگار

101 جور اُستاد بہ ز مہر پدر

102 چو دخلت نیست خرج آہستہ تر کن

103 کریمان را بدست اندر درم نیست
خداوندانِ نعمت را کرم نیست

104 پراگندہ روزی پراگندہ دل
خداوندِ روزی بحق مشتغل

105 سگے را گر کلوخے بر سر آید
ز شادی بر جہد کاین استخوان ست
وگر نعشے دو کس بردوش گیرند
لئیم الطبع پندارد کہ خوان ست

106 ہر جا کہ گلست خارست

107 منت منہ کہ خدمت سلطان ہمیکنم
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

108 نہ محقق بود نہ دانشمند
چار پائے برو کتابے چند

109 پیش دیوار انچہ گوئی ہوشدار
تا نباشد در پس دیوار گوش

110 ہمہ کس عقل خود بہ کمال نماید و فرزندِ خود بجمال

111 گر از بسیط زمین عقل منعدم گردد
بخود گمان نبرد ہیچ کس کہ نادانم

112 کہ خبث نفس نگردد بسالہا معلوم

113 درشتی و نرمی بہم در بہ است
چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

114 مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

115 اندک اندک شود بہم بسیار

116 کہ بسیار خوار ست بسیار خوار

117 بر رسولان بلاغ باشد و بس

118 کہن جامۂ خویش آراستن
بہ از جامۂ عاریت خواستن

یہ تمام مقولے جو نقل کیے گئے اِن میں زیادہ تر ایسے ہیں جو تحریر اور تقریر دونوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر تقریباً اسی قدر فقرے اور اشعار گلستان میں ایسے اور بھی ہیں جو محض تحریروں میں برتے جاتے ہیں وہ یہاں نقل نہیں کیے گئے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں گلستان اور بوستان شایع ہوئی ہیں وہاں زیادہ تر اُن کا استعمال کم عمر اور بے استعداد لڑکوں کی تعلیم و تعلّم میں پایا جاتا ہے۔ اور اِسی لیے چھ سو برس سے شیخ کے یہ دونوں کارنامے برابر بازیچۂ طفلاں اور دستخوش کودکاں رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس سن و سال کے لڑکوں کو یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اُن کی استعداد اور سمجھ اس قابل نہیں ہوتی کہ شیخ کی فصاحت و بلاغت کا جو کہ اُس نے اِن کتابوں میں برتی ہے کچھ بھی اندازہ کر سکیں۔ لیکن چونکہ بچوں کا حافظہ عمدہ ہوتا ہے اس لیے کچھ کچھ فقرے یا اشعار اُن کو یاد رہ جاتے ہیں۔ پس جس قدر گلستان اور بوستان کے فقرے اور اشعار بول چال میں ضرب المثل ہو گئے ہیں اُن میں زیادہ تر وہ ہیں جو لوگوں کو بچپن سے نوک زبان ہوتے ہیں اور جن کے مضمون سے وہ باوجود صغرِ سن کے لذت یاب ہو چکے ہیں۔ ورنہ اگر یہ کتابیں بھی سکسپیرز کی طرح ایشیا کے ہر طبقے اور ہر گروہ کے مطالعے میں رہتیں اور عورت اور مرد اور بوڑھے اور جوان سب لوگ اُن کو دیکھا کرتے تو میں امید کرتا ہوں کہ گلستان کا ایک بڑا حصہّ اور اُس سے کسی قدر کم بوستان کے اشعار جمہور کی زبان پر اسی طرح جاری ہو جاتے جیسے مذکورہ بالا فقرے اور اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ کیونکہ اِن دونوں کتابوں میں شیخ کا بیان اس قدر عام طبائع کے مناسب اور ہر فرقہ اور گروہ کی ضرورت اور مذاق اور اغراض کے موافق واقع ہوا ہے کہ ہر فقرے اور ہر شعر میں ضرب المثل ہونے کی قابلیت پائی جاتی ہے۔ ہمیشہ وہ اقوال ضرب المثل بنتے ہیں جن کا مضمون عام لوگوں کے حسب حال ہو۔ الفاظ سیدھے اور صاف ہوں اور انداز بیان میں کسی قدر لطافت پائی جائے۔ سو یہ خاصیت شیخ کے کلام میں عموماً اور گلستان بوستان میں خصوصاً پائی جاتی ہے۔

یہاں ہم گلستان کے متعلق بحث ملتوی کر کے کسی قدر بوستان کا حال لکھتے ہیں۔ یہ کتاب بھی تقریباً اُسی قدر مقبول ہوئی ہے جس قدر گلستان اور اُس کی تعلیم بھی اکثر ملکوں میں اُسی طرح جاری ہے جیسے گلستان کی۔ مثنوی میں فردوسی کو عموماً تمام شعرا پر ترجیح دی گئی ہے اور

حقیقت میں رزم کا بیان باوجود نہایت سادگی اور صفائی کے جیسا موثر اور پُر جوش اُس کی قلم سے تراوش کرتا ہے ایسا اور کسی سے بن نہیں آیا۔ لیکن مثنوی میں مطلقاً فردوسی کو سب سے افضل قرار دینا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک جس طرح طعن وضرب اور جنگ وحرب کا بیان فردوسی پر ختم ہے اسی طرح اخلاق نصیحت وپند، عشق وجوانی، ظرافت ومزاح، زہد وریا وغیرہ کا بیان شیخ پر ختم ہے۔ شاہنامہ میں جہاں کہیں فردوسی کو بہادری اور رزم کے سوا کوئی اور بیان کرنا پڑتا ہے وہاں اُس کے کلام میں وہ خوبی اور لطافت نہیں پائی جاتی۔ یہی سبب ہے کہ اُس کی عشقیہ مثنوی یوسف وزلیخا اس قدر مقبول نہیں ہوئی جس قدر شاہنامہ مقبول ہوا ہے۔ شیخ نے بوستان میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے میرے کلام کی بہت سی تعریف کرنے کے بعد مجھ پر یہ اعتراض کیا کہ اُس کو بہادری اور رزم کا بیان کرنا ویسا نہیں آتا جیسا کہ اور لوگوں کو آتا ہے یہ قصہ نقل کر کے شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ ''ہم کو لڑائی کا خیال ہی نہیں ہے ورنہ ہم کسی بیان سے عاجز نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ میں اپنی تیغ زبان کو میان سے نکال کر تمام دفتر شعر وسخن پر قلم پھیر دوں۔'' اس کے بعد ایک حکایت شاطر صفاہانی کی جنگ تاتار کے ذکر میں لکھی ہے جس سے اپنا رزمیہ بیان دکھانا مقصود ہے اگرچہ شیخ کی شیریں زبانی اور فصاحت کا انکار نہیں ہوسکتا لیکن شاہنامے کی نظم کے سامنے اس کا رنگ جمنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ تمام محسوسات اور وجدانیات کے مرغوب ونامرغوب ہونے میں الف وعادت کو بڑا دخل ہے۔ مرچ جس قدر عام ہندستانیوں کو عادت مستمرہ کی وجہ سے مرغوب ہے اُسی قدر اکثر غیر ملک والوں کو خلاف عادت ہونے کے سبب نامرغوب ہے۔ اکثر عطر ہم کو خوشگوار اور غیر ملک والوں کو سخت ناگوار معلوم ہوتے ہیں اسی طرح لطفِ شعر جو کہ ایک وجدانی امر ہے بغیر الف وعادت کے ہرگز محسوس نہیں ہوتا۔ مثلاً انیس ودبیر کے مرثیے جس پیرایے اور لباس میں مقبول ہوئے ہیں وہ پیرایہ اس قدر مانوس ہوگیا ہے کہ اُس کے بغیر مرثیہ مقبول ہونا مشکل ہے یعنی ضرور ہے کہ کچھ بند تلوار کی اور کچھ گھوڑے کی تعریف میں لکھے جائیں۔ کچھ بند ایسے بھی ہوں جن سے خود مرثیہ گو کی تعلّی اور فوقیت اوروں پر ظاہر ہو۔ یہ بھی ضرور ہے کہ مرثیہ مسدّس میں لکھا جائے اور مسدّس اُنھیں بحروں میں سے کسی بحر میں ہو جو انیس ودبیر نے اختیار کی ہیں۔ پس جن خصوصیتوں کے ساتھ شاہنامہ مقبول ہوا ہے اُن کے

بغیر کسی کی رزمیہ نظم مقبول نہیں ہوسکتی۔ضرور ہے کہ خالص فارسی میں جو عربی الفاظ سے پاک ہو رزم لکھی جائے اور بیشمار الفاظ جن میں فردوسی نے تصرف کیا ہے اور قیاس لغوی کے خلاف استعمال کیے ہیں کبھی کبھی قصداً اسی طرح برتے جائیں جیسے شاہنامے میں برتے گئے ہیں اور بے انتہا حشو و زوائد جن سے شاہنامہ بھرا ہوا ہے اشعار میں بہ تکلف داخل کیے جائیں۔ پس شیخ کی رزمیہ حکایت جو شیخ کے شاہنامے سے میل نہیں کھاتی اس کا یہی سبب ہے کہ شیخ نے ان باتوں میں سے کسی بات کا التزام نہیں کیا۔فردوسی نے بھی یہی گر اختیار کیا تھا جس سے اُس کی مثنوی مقبول ہوئی۔ دقیقی نے جو فردوسی سے پہلے ہزار بیتوں میں گشتاسپ اور ارجاسپ کی داستان نظم کی تھی وہ سب کو پسند آ چکی تھی۔ جب دقیقی وہ داستان لکھ کر دفعتہً مر گیا اور فردوسی کی نوبت آئی تو اُس نے بھی وہی روش اختیار کی جو دقیقی نے اختیار کی تھی۔ چنانچہ دقیقی کی لکھی ہوئی داستان عام شاہناموں میں موجود ہے۔دونوں کے کلام میں کوئی نمایاں فرق نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں تک کہ جو لوگ اِس حال سے واقف نہیں ہیں وہ اُس کو بھی فردوسی ہی کا کلام سمجھتے ہیں۔

فارسی میں چار مثنویاں ہیں جو شہرت اور قبولیت میں تقریباً متساوی الاقدام ہیں شاہنامہ، سکندر نامہ، مثنوی معنوی اور بوستان، شاہنامے اور مثنوی معنوی کو سکندر نامے اور بوستان سے وہ نسبت ہے جو ایک کامل خوشنویس کی بے ساختہ مشق کو اُس کے بنائے ہوئے اور مرتب کیے ہوئے قطعے سے ہوتی ہے۔قطعہ اگرچہ رخ اور کرسی اور حروف کی نشست اور تقسیم وغیرہ کے لحاظ سے مشق کی نسبت بے عیب ہوتا ہے اور اُس کے اجزا میں پست و بلند کا تفاوت بہت کم ہوتا ہے اور تمام حروف تقریباً ہموار اور یکساں معلوم ہوتے ہیں مگر مشق میں بہت سی کششیں اور دوائر وغیرہ بے ساختہ اُس کے قلم سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ اگر خوشنویس خود کوشش کرے تو قطعے میں شاید ویسی کششیں اور دائرے نہ لکھ سکے یہی سبب ہے کہ خوشنویس لوگ اگلے اُستادوں کی مشق کو اُن کے قطعات سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ فردوسیؒ اور مولانا رومؒ نے اگرچہ اپنی مثنویوں میں بخلاف نظامی اور سعدی کے الفاظ کی زیادہ تنقیح و تہذیب اور کانٹ چھانٹ نہیں کی مگر باوجود اِس کے صدہا مقامات اُن سے ایسے حسن و خوبی کے ساتھ ادا ہوئے ہیں کہ تکلف اور ساختگی کی حالت میں شاید ادا نہ ہوسکتے۔

بوستان اور سکندر نامہ صرف اس لحاظ سے کہ دونوں کمال تنقیح وتہذیب اور زحمت فکر و نظر کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور دونوں میں صنعتِ شاعری کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ شاید ایک دوسرے سے مشابہ ہوں۔ لیکن دونوں کے اندازِ بیان میں بہت بڑا تفاوت ہے سکندر نامے میں شاعرانہ مبالغہ، زور بیان، شوکتِ الفاظ، طُرفگی استعارات، تنوع تمثیلات، ایک ایک مطلب نئے نئے اسلوب سے ادا کرنا۔ ہر داستان کو ایک بڑی دھوم دھام کی تمہید کے ساتھ شروع کرنا اور اسی طرح کی اور شاندار باتیں پائی جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے بوستان میں نہایت سادگی، الفاظ کی نرمی اور گھلاہٹ، ترکیبوں کا سلجھاؤ، بیان کی صفائی، عبارت کی دلنشینی، خیالات کی ہمواری، مبالغہ میں اعتدال، ماخذ میں سہولیت، حسن ترتیب، لطفِ ادا، تمثیلات کی برجستگی، استعارات کی لطافت، کنایات کی شوخی، باوجود صنعت شاعری کے نہایت بے تکلفی اور باوجود ساختگی کے کمال بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔

مثلاً اس مطلب کو کہ زمین میں خدا کی بے انتہا مخلوق دبی ہوئی ہے۔ مولانا نظامی سکندر نامے میں اس طرح ادا کرتے ہیں۔

فلک در بلندی زمین در مغاک — یکے طشت خون شد یکے طشت خاک
نبشتہ برین ہر دو آلودہ طشت — ز خونِ سیاوش بسے سر نوشت
زمین گر بضاعت برون آورد — ہمہ خاک در زیر خون آورد

یہی مطلب سکندر نامے میں دوسری جگہ اِس طرح بیان ہوا ہے۔

کہ داند کہ این دخمۂ دام و دد — چہ تاریخہا دارد از نیک و بد
چہ نیرنگ با بخر دان ساختہ است — چہ گردن کشان را سر انداختہ است

شیخ نے اسی مطلب کو بوستان میں یوں بیان کیا ہے۔

زدم تیشہ یک روز بر تل خاک — بگوش آمدم نالۂ دردناک
کہ زنہار گر مردی آہستہ تر — کہ چشم و بنا گوش درویست و سر

یہی مطلب بوستان میں دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے۔

درین باغ سروے نیامد بلند — کہ بادِ اجل بیخش از بُن بکند
عجب نیست بر خاک اگر گل شگفت — کہ چندین گل اندام در خاک خفت

قناعت کی ترغیب سکندر نامے میں اِس طرح دی ہے۔

تو نیز ار نہی بار گردن ز دوش | ز گردن کشان بر نیاری خروش
چو دریا بسرمایۂ خویش باش | ہم از بودِ خود سودِ خود برتراش
بمہمانیِ خویش تا روزِ مرگ | درختے شو از خویشتن ساز برگ
چو پیلہ ز برگِ کسان خورد گاز | ہمہ تن شد انگشت و تے کرد باز

بوستان میں یہی مطلب اس طرح ادا ہوا ہے۔

شنیدم کہ در روزگار قدیم | شدے سنگ بر دستِ ابدال سیم
مپنداری این قول معقول نیست | چو قانع شدی سیم و سنگت یکیست
چو طفل اندرون دارد از حرص پاک | چہ مشتِ زرش پیش و چہ مشتِ خاک
خبر دہ بدرویشِ سلطان پرست | کہ سلطان ز درویش مسکین ترست
گدا را کند یکدرم سیم سیر | فریدون بملکِ عجم نیم سیر
گدائے کہ بر خاطرش بند نیست | بہ از بادشاہے کہ خرسند نیست
بخسپند خوش روستائی و جفت | بذوقے کہ سلطان در ایوان نخفت

مآل اندیشی اور پیش بینی کی نصیحت سکندر نامے میں اس طرح کی گئی ہے۔

میفکن گول گرچہ عار آیدت | کہ ہنگام سرما بکار آیدت
خرے بر گریوہ ز سختی بمُرد | کہ از کاہلی جلّ با خود نبرد

یہی مضمون بوستان میں اس طرح ادا کیا گیا۔

بہ دختر چہ خوش گفت بانوی دہ | کہ روزِ نوا برگِ سختی بنہ
ہمہ وقت پُر دار مشک و سبوے | کہ پیوستہ در دہ روان نیست جوے

سکندر نامے میں عہد شباب پر تحسر اس طرح کیا گیا ہے۔

جوانی شد و زندگانی نماند | جہان گو ممان چون جوانی نماند
جوانی بود خوبیِ آدمی | چو خوبی رود کے بود خرمی
چو پے سست و بوسیدہ شد استخوان | دگر قصۂ خوبروئی مخوان
غرور جوانی چو از سر گذشت | ز گستاخ کاری فرو شوی دست

بہی چہرۂ باغ چندان بود — کہ شمشاد با لالہ خندان بود
چو بادِ خزانی در افتد بباغ — زمانہ دہد جائے بلبل بہ زاغ
بود برگِ ریزان چو شاخ بلند — دلِ باغبان زان شود دردمند
ریاحین ز بُستان شود ناپدید — در باغ را کس نجوید کلید
بنال اے کُہن بلبل سال خورد — کہ رخسارۂ سرخ گل گشت زرد
دوتا شد سہی سروِ آراستہ — کدیور شد از باغ برخاستہ
چو تاریخ پنجہ درآمد بسال — دگرگونہ شد بر شتابندہ حال
سر از بارتنگی درآمد بسنگ — جمازہ بہ تنگ آمد از راہِ تنگ
فروماند دستم ز مے خواستن — گران گشت پایم ز برخاستن
تنم گونۂ لاجوردی گرفت — گلم سُرخی انداخت زردی گرفت
ہیونِ روندہ زرہ ماند باز — بابلین گہ آمد سرم را نیاز
ہمان بور چوگانیِ باد پایے — بصد زخم چوگان نہ جنبد ز جایے
طرب را ز میخانہ گم شد کلید — نشان پشیمانی آمد پدید

بوستان میں یہی مضمون ایک حکایت کی ضمن میں اس طرح ادا کیا گیا ہے۔

چو باد صبا بر گلستان و زد — چمیدن درختِ جوان را سزد
چمد تا جوان ست و سرسبز و خید — شکستہ شود چون بہ زردی رسید
بہاران کہ بار آورد بید مشک — بریزد درختِ کہن برگ خشک
نہ زیبد مرا با جوانان چمید — کہ بر عارضم صبح پیری دمید
بقید اندرم جرہ بازے کہ بود — دمادم سر رشتہ خواہد ربود
شمارا ست نوبت برین خوان نشست — کہ ما از تنعم بشستیم دست
چو بر سر نشست از بزرگی غبار — دگر چشمِ عیش جوانی مدار
مرا برف بارید بر پر زاغ — نشاید چو بلبل تماشاے باغ
کند جلوہ طاؤسِ صاحب جمال — چہ میخواہی از باز برکندہ بال
مرا غلہ نیک آمد اندر درو — شما را کنون میدمد سبزۂ نو

گلستانِ ما را طراوت گذشت | کہ گلدستہ بندد چو پژمردہ گشت
مرا تکیہ جانِ پدر بر عصا ست | دگر تکیہ بر زندگانی خطا ست
مسلم جوان راست بر پاے جست | کہ پیران برند استعانت بدست
گل سرخ رویم نگر زرّ ناب | فرو رفت چون زرد شد آفتاب
ہوس پختن از کودکِ نا تمام | چنان زشت نبود کہ از پیر خام
مرا مے بباید چو طفلان گریست | ز شرم گناہان، نہ طفلانہ زیست
نکو گفت لقمان کہ نا زیستن | بہ از سالہا بر خطا زیستن
ہم از با مداوان در کلبہ بست | بہ از سود و سرمایہ دادن ز دست
جوان تا رساند سیاہی بنور | برَد پیر مسکین سپیدی بگور

مذکورہ بالا مثالوں کے ملاحظے سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ کے خیالات ہمیشہ سہل الماخذ ہوتے ہیں۔ وہ معنی مقصود کو ایسی تمثیلوں میں بیان کرتا ہے جو ہمیشہ خاص و عام کے مشاہدے میں آتی ہیں۔ بخلاف مولانا نظامیؒ کے کہ اُن کے خیالات اور تمثیلات اکثر غرابت اور ندرت سے خالی نہیں ہوتیں۔

شیخ نے جو شاطرِ صفاہانی کی حکایت میں اپنا رزمیہ بیان دکھایا ہے اگر چہ بے تکلفی اور سادگی میں فردوسیؒ کے بیان سے نہیں ملتا لیکن مولانا نظامیؒ کی رزم سے جس میں سادگی کی نسبت شاعری کا زیادہ لطف ہے بہت مشابہت رکھتا ہے چند شعر اِس حکایت کے اور اُن کے ہم مضمون اشعار سکندر نامے کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔

بوستان	سکندرنامہ
دو لشکر بہم برزدند از کمین	دو لشکر چو مور و ملخ تا ختند
تو گفتی زدند آسمان بر زمین	نبرد جہان در جہان ساختند
ز باریدنِ تیر ہمچون تگرگ	بشمشیر پولاد و تیرِ خدنگ
بہر گوشہ برخاست طوفانِ مرگ	گذرگاہ بر مور کردند تنگ
بصید ہزبرانِ پُرخاش ساز	کمند اژدہاے مسلسل شکنج
کمند اژدہاے دہن کردہ باز	دہن باز کردہ بتاراج گنج

زمین آسمان شد ز گرد کبود	زمین کو بساطے بُد آراستہ
چو انجم درو برق شمشیر و خود	غبارے شد از جاے برخاستہ
چو ابر اسپ تازی بر انگیختیم	برانگیخت رزمے چو بارندہ میغ
چو باران پلارک فرو ریختیم	نگرگش ز پیکان و باران ز تیغ

مگر حق یہ ہے کہ ایک دو حکایت کے ملا دینے سے مساوات اور برابری کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ رزم میں فردوسی اپنی جگہ اور نظامی اپنی جگہ فی الحقیقت اپنا مثل نہیں رکھتے۔

شیخ علی حزیں نے جس کو ہندستان میں خاتم الشعرا سمجھتے ہیں بیس بائیس صفحے کی ایک مثنوی جس کا نام خرابات ہے بوستان کی طرز میں لکھی ہے اور اپنی عادت کے موافق اُس پر بہت کچھ افتخار کیا ہے چنانچہ مثنوی کے خاتمے میں فرماتے ہیں۔

سخن سنج گر ہست ہشیار مغز	کند قوت جان این گہرہائے نغز
ازین نامہ گردون پُر آوازہ شد	روانِ سخن گستران تازہ شد
نوائے کہ این خامہ بنیاد کرد	دلِ طوسی رودکی شاد کرد
بگوشِ نظامی اگر میرسید	ق سرودے ازین خسروانی نشید
بہ تعظیم من رُخ نہادی بخاک	کہ احسنت اے نیر تابناک
دگر سعدی شہد پرور ادا	ق شنیدے ز صورِ نے من نوا
سماعش ز سر عقل بردے و ہوش	زبان مہر کردے شدے جملہ گوش

معلوم ہوتا ہے کہ علی حزیں نے اپنے نزدیک اس مثنوی میں بوستان کے تتبع کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور وہ اُس کو اپنے لیے ایک سرمایہ نازش سمجھتا تھا۔ سوانح عمری میں اسی مثنوی کی نسبت لکھتا ہے کہ "بسیارے از مطالب عالیہ وسخنان دلپذیر درآن کتاب بسلک نظم درآمد" مگر دونوں کتابوں یعنی بوستان اور خرابات کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صورتیں ایک شکل کی ہیں۔ ایک جاندار دوسری بے جان، لفظ اچھے، بیان اچھا، مطالب عمدہ، یہ سب کچھ سہی۔ مگر شیخ کے بیان میں ایک چُھپا ہوا جادو ہے جو بوستان کو خرابات سے بالکل الگ کردیتا ہے۔ چنانچہ ذیل کی مثال سے دونوں کا فرق بخوبی معلوم ہوسکتا ہے۔ قحط کا بیان ایک جگہ بوستان میں بھی کیا گیا ہے اور خرابات میں بھی اتفاق سے یہ مضمون نکل آیا ہے۔ ہم دونوں

کے اشعار اِس مقام پر نقل کرتے ہیں اور فرق جو دونوں کے طرز بیان اور طریقۂ ادا میں ہے اُس کو بھی کسی قدر بیان کریں گے۔

بوستان	خرابات
چناں قحط سالے شد اندر دمشق	شنیدم کہ در عہد بہرام گور
کہ یاران فراموش کردند عشق	نمود از قضا قحط سالے ظہور
چنان آسمان بر زمین شد بخیل	چو صحراے محشر زمین تف گرفت
کہ لب تر نکردند زرع و نخیل	بہ دریوزۂ آسمان کف گرفت
بخوشید سر چشمہاے قدیم	سحابِ سیہ دل نشد مہربان
نماند آب جز آبِ چشمِ یتیم	بحال لب تشنۂ خاکیان
نبودے بجز آہِ بیوہ زنے	بخیلی نمود ابر بر کائنات
اگر برشدے دودے از روزنے	بعہدِ زمین سوخت طفلِ نبات
چو درویش بے برگ دیدم درخت	زخشکی در اندامِ خاک دوتوہ
قوی بازوان سست و درماندہ سخت	عروق شجر شد چو رگہای کوہ
نہ بر کوہ سبزی نہ در باغ شخ	ز تاب فروزندہ مہر بلند
ملخ بوستان خورد و مردم ملخ	زمین مجمر و دانہ بودش سپند
	بطے چو پستان بے شیر شد
	زخشکی چو پیکان گلو گیر شد

شیخ سعدی نے پہلے ہی شعر کے دوسرے مصرعے میں جس حُسن و لطافت کے ساتھ قحط کی سختی کی تصویر کھینچی ہے اِس سے بہتر کوئی اسلوب بیان خیال میں نہیں آتا۔

قحط کی شرح ایک کتاب میں ایسی خوبی کے ساتھ نہیں ہوسکتی جیسی اِس ایک مصرعے میں ہوئی ہے ''کہ یاران فراموش کردند عشق'' سہل ممتنع کا لفظ جو اکثر بولا جاتا ہے وہ اسی قسم کے بیان کو کہتے ہیں کہ بادی النظر میں نہایت سرسری معلوم ہو مگر وہی مطلب دوسری بار کسی سے بلکہ خود مصنف سے بھی ویسا بیان نہ ہو سکے۔ اِس بیان میں لطف یہ ہے کہ قحط کے بیان کے جتنے معمولی اسلوب ہیں یہ اسلوب اُن سب سے علیحدہ ہے قحط کی سختی ہمیشہ اس طرح بیان کی

جاتی ہے''ایسا قحط پڑا کہ روٹی جان سے زیادہ عزیز ہوگئی، آدمی بھوک میں آدمیوں کو کھا گئے۔
ماں باپ نے ایک ایک روٹی کے بدلے اولاد کو بیچ دیا۔ لاکھوں جاندار بھوکے مر گئے۔
غرضیکہ تمام بیان ایسے ہوتے ہیں جن سے غلہ کی گرانی، پانی کی نایابی، بھوک کی تکلیف اور
اسی قسم کی باتیں سمجھی جائیں۔ شیخ نے وہ اسلوب اختیار کیا ہے جو سب سے نرالا اور سب سے
بلیغ ہے۔ اس اسلوب سے اُس کو یہ جتانا مقصود ہے کہ شاعر کے نزدیک عشق ایک ایسی چیز ہے
جو کسی حالت میں فراموش نہیں ہوتی۔ باوجود اس کے لوگ اُس کو بھول گئے تھے۔ اور یاران
کے لفظ سے یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ مصنف بھی اُسی عشاق کے جرگے میں تھا۔ دوسرے شعر کا
صرف یہ مطلب ہے کہ مینھ نہ برساتھا۔ مگر اُس کو کس عمدگی سے بیان کیا ہے۔ تیسرے شعر میں
پانی کا نایاب ہونا اور پھر یتیم کے آنسو کو اُس سے مستثنٰی کرنا۔ چوتھے شعر میں کسی گھر کے روزن
سے باورچی خانہ کے دھوئیں کا نہ نکلنا اور پھر اُس سے رانڈوں کی آہ کے دھوئیں کو مستثنٰی کرنا۔
پانچویں شعر میں درختوں کو بے برگی میں قحط زدہ درویشوں اور مسکینوں سے تشبیہ دینا اور قوی
پہلوانوں کا بے بس اور عاجز ہو جانا یہ تمام اسلوب کس قدر لطیف اور دلکش ہیں۔ چھٹا شعر
بلاغت اور حُسنِ بیان میں تقریباً ویسا ہی اعلیٰ درجے کا ہے جیسا پہلا۔ باوجود اِن تمام خوبیوں
کے کوئی بات ایسی نہیں جو نیچر یا عادت کے خلاف ہو۔ قحط میں عشق کے ولولوں کا نیست و نابود
ہو جانا، درختوں کا سرسبز نہ ہونا، چشموں اور ندیوں کا خشک ہو جانا، یتیموں کا رونا، گھروں میں
کھانا نہ پکنا، بے وارث رانڈوں کے آہ و نالے، درختوں کا بے برگ و بار اور غریبوں کا بے
سروسامان ہونا، پہلوانوں اور زبردستوں کا درماندہ ہو جانا، پہاڑ اور جنگل میں سبزہ اور
ہریاول کا نہ رہنا، ٹڈیوں کا باغ اور کھیتی کو اور آدمیوں کا ٹڈیوں کو کھانا، یہ سب باتیں ایسی ہیں
جو قحط کے زمانے میں اکثر کم و بیش ظہور میں آتی ہیں۔

حزیں نے باوجود اس کے کہ خرابات جو چند اوراق سے زیادہ نہیں ہے بوستان سے
پانچ سو برس بعد لکھی ہے اور جیسا کہ اُس کے بیان سے مترشح ہوتا ہے اپنی پوری طاقت شیخ کے
تتبع میں صرف کی ہے کوئی کرشمہ اُس کی مثنوی میں ایسا نہیں پایا جاتا جس کو دیکھ کر جی بے
اختیار پھڑک اُٹھے۔

پہلا شعر ہموار اور صاف ہے اُس میں کوئی خوبی قابل ذکر نہیں۔ دوسرے شعر میں

زمین تفتہ کو صحراے محشر سے تشبیہ دینا تعریف الشی بالمجہول کے قبیل سے ہے یعنی ایک ایسی تمثیل ہے جو اہل دنیا کی نظر میں قحط کی تصویر کھینچنے سے قاصر ہے۔ صحراے محشر اور تمام اعتقادیات خود تمثیل کے محتاج ہیں اُن پر قیاس کرنے سے کسی شے کی حقیقت نہیں کھل سکتی۔ تیسرا شعر بوستان کے اُس شعر سے ماخوذ ہے جو ذوالنون مصری اور مصر کے قحط کے بیان میں شیخ نے لکھا ہے اور وہ یہ ہے۔

خبر شد بہ مدین پس از روز بیست کہ ابرِ سیہ دل بر ایشان گریست

مگر اتنا فرق ہے کہ شیخ نے ابر کے برسنے کو رونے سے تعبیر کیا ہے جس سے ترحم اور برسنا دونوں باتیں ٹپکتی ہیں اور حزیں نے برسنے کو مہربان ہونے سے تعبیر کیا ہے جس سے دونوں معنی ویسے صاف نہیں نکلتے۔ چوتھا شعر شیخ کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

چنان آسمان بر زمین شد بخیل کہ لب تر نکردند زرع و نخیل

مگر شیخ کے بیان میں اتنا لطف زیادہ ہے کہ کھڑی کھیتی کا خشک ہو جانا زیادہ حسرت ناک ہے بہ نسبت اِس کے کہ تخم زمین کے اندر ہی جل جاے۔ پانچویں شعر کا دوسرا مصرعہ بہت عمدہ مگر پہلا مصرعہ تکلف سے خالی نہیں۔ شعر کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ زمین کی خشکی کے سبب درختوں کی رگیں پہاڑ کی رگوں کی طرح سوکھ گئی تھیں۔ پس اندام اور دو توہ کے لفظ کو افادہ معنی میں کچھ دخل نہیں ہے۔ چھٹے شعر میں صرف یہ بیان ہے کہ آفتاب کی گرمی سے زمین انگیٹھی کی طرح جلتی تھی اور تخم جو اُس پر ڈالا جاتا تھا وہ سپند کا حکم رکھتا تھا۔ پس فروزندہ اور باز جو دو صفتیں مہر کی واقع ہوئی ہیں اُنھوں نے کچھ فائدہ نہیں دیا اور اگر یہ کہا جائے کہ فروزندہ مہر کہنے سے آفتاب کی گرمی کا زیادہ ثبوت ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ مہر بلند کہنے سے اُس کی گرمی کا خیال کم ہو جاتا ہے اور ایسی دو متضاد صفتیں لانی بلاغت کے خلاف ہیں۔ ساتویں شعر کا مضمون بالکل خلافِ عادت اور خلاف مقتضاے مقام ہے۔ نہ قحط کا یہ خاصہ ہے کہ شراب کی صراحی کو خشک کر دے اور نہ صراحی کا خشک ہونا اِس بات کی دلیل ہے کہ قحط کی شدت ہو رہی ہے۔

یہ جو کچھ ہم نے بطور محاکمے کے لکھا ہے اِس سے خانِ آرزو کی طرح شیخ علی حزیں پر حرف گیری کرنی ہمارا مقصود نہیں ہے اور نہ بوستان کو خرابات سے افضل ثابت کرنا مدنظر ہے

کیونکہ نہ ہم شیخ علی حزیں پر حرف گیری کرنے کی لیاقت رکھتے ہیں اور نہ بوستان کے افضل ہونے میں کسی کو شبہ ہے بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ کوئی شے فی نفسہ کیسی ہی بے عیب ہو جب وہ کسی ایسی شے کے مقابلے میں لائی جاتی ہے جو اُس سے بمراتب افضل اور فائق ہو تو اُس میں بیسیوں فروگذاشتیں اور قصور نظر آنے لگتے ہیں اگر خرابات بوستان کے جواب میں نہ ہوتی اور حسن اتفاق سے ایک مضمون کی حکایتیں دونوں مثنویوں میں نہ نکل آتیں تو حزیں کے بیان میں چون و چرا کرنے کا ہم کو خیال بھی نہ آتا کیونکہ یہ باتیں تقریباً تمام شعرا کے ہاں عامۃ الورود ہیں۔

اب ہم گلستان اور بوستان کی چند خاصیتیں ایسی بیان کرتے ہیں جو دونوں کتابوں میں تقریباً یکساں پائی جاتی ہیں اور جن کو اُن کے مقبول ہونے میں بہت بڑا دخل ہے۔

مثالوں کی جہاں ضرورت ہوگی کہیں صرف گلستان سے اور کہیں صرف بوستان سے اور کہیں دونوں سے نقل کی جائیں گی۔

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اِن کتابوں کے مقبول ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ اِن میں سرتاپا اخلاق اور تہذیبِ نفس کے مضامین مندرج ہیں مگر میرے نزدیک اِن کی مقبولیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اخلاق اور مواعظ کو شیخ کے سوا کسی نے ایسی خوبی اور لطافت کے ساتھ فارسی زبان میں بیان نہیں کیا اخلاق میں بیسیوں کتابیں فارسی میں لکھی گئی ہیں اور اب تک موجود ہیں اور غالباً گلستان اور بوستان میں کوئی پند و نصیحت ایسی نہ ہوگی جو اوروں نے نہ لکھی ہو مگر کوئی کتاب اِن دونوں کتابوں کے برابر مقبول نہیں ہوئی۔ اِس سے ظاہر ہے کہ قبولِ عام کا مدار زیادہ تر حسنِ بیان اور لطفِ ادا پر ہے نہ کہ نفس مضامین پر۔ البتہ مضامین کو بھی شہرت اور قبولیت میں بہت بڑا دخل ہے۔ اسی لیے جو محاسن اِن کتابوں کے ہم آگے لکھنے چاہتے ہیں وہ کسی قدر مضامین سے اور زیادہ تر حسن معنی اور اسلوب بیان سے متعلق ہوں گے۔

(1) سب سے زیادہ تعجب انگیز بات اِن دونوں کتابوں میں یہ ہے کہ جن باتوں میں مشرقی لٹریچر عموماً بدنام ہے وہ اِن کتابوں میں اس قدر کم ہیں کہ چند مقامات مستثنیٰ کرنے کے بعد کوئی ایسی بات باقی نہیں رہتی جو زمانہ حال کے مورل اور سوشل خیالات کے برخلاف ہو۔ اور یہ امر ایسی پُرانی کتابوں میں جن کے زمانہ تصنیف کو ساڑھے چھ سو برس سے زیادہ گزر

چکے ہیں کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے مثلاً مبالغہ اور اغراق جو مشرقی انشا کا خاصہ ہے اِن کتابوں میں اتنا کم ہے جتنا ایران کے اور شعرا کے کلام میں سچ اور جہاں ہے وہاں نہایت لطیف اور بامزا ہے اور اعتدال کی حد سے متجاوز نہیں مثلاً شیخ بوستان میں کہتا ہے۔

میانِ دو کس دشمنی بود و جنگ ‫   ‫ سر از کبر بریکدگر چون پلنگ

ز دیدار ہم تا بحدّے رمان ‫   ‫ کہ بر ہر دو تنگ آمدے آسمان

دوسری بیت کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک دوسرے کی صورت سے ایسے بیزار تھے کہ جب کبھی راہ میں دوچار ہو جاتے تھے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر رستے سے اُلٹے ہٹ جاتے تھے اور اُس وقت کمالِ نفرت سے اُن کا جی چاہتا تھا کہ آسمان جو سامنے حائل نظر آتا ہے اُس کو توڑ کر نکل جائیں۔ یہ مبالغہ جیسا کہ بادی النظر میں بڑا معلوم ہوتا ہے فی الحقیقت ایسا نہیں ہے کیونکہ نفرت ایک نفسانی کیفیت ہے جس کا کوئی اندازہ اور پیمانہ مقرر نہیں ہے۔ پس جس طرح ادنیٰ درجے کی نفرت یہ ہے کہ دو دشمن ایک مجلس میں اکٹھا ہونا پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح انتہا درجے کی نفرت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک عالم میں رہنا پسند نہ کریں۔

اسی طرح شیخ کی نظم و نثر میں جہاں کہیں مبالغہ پایا جاتا ہے لطافت سے خالی نہیں ہوتا مثلاً گلستان میں ایک دولت مند بخیل کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں۔ دو مالدارے را شنیدم کہ بہ بخل چنان معروف بود کہ حاتم طائی بہ سخاوت۔ ظاہر حالش بہ نعمت دنیا آراستہ و خسّتِ نفس در نہادش ہمچنان متمکن۔ تا بجائیکہ نانے را بجانے از دست ندادے و گربۂ ابوہریرہ را بہ لقمہ ننواختے و سگِ اصحاب کہف را استخوانے نیند اختے۔ فی الجملہ کسے خانۂ او را ندیدے در کشادہ و سفرۂ او را سر۔

بیت

درویش بجز بوی طعامش نشمیدے ‫   ‫ مُرغ از پسِ نان خوردن او ریزہ نچیدے

ایک اور جگہ سمندر کی موج اور طوفان کا بیان اِس طرح کیا ہے۔ ''ہمگین آبے کہ مرغابی درو ایمن نبودے'' اگر غور سے دیکھئے تو حد سے زیادہ مبالغہ ہے۔ مگر بادی النظر میں کوئی ناممکن بات نہیں معلوم ہوتی۔

سوپر نیچرل یعنی فوق العادۃ باتیں اور عجیب و غریب قصے بھی جن سے قدیم اور متوسط

زمانے کا مغربی اور مشرقی لٹریچر بھرا ہوا ہے اِن کتابوں میں بہت کم ہیں۔ تمام گلستان اور بوستان میں صرف دو تین حکایتیں ایسی ہیں جو اس زمانے میں مستبعد معلوم ہوتی ہیں اور تاویل کے بعد اُن میں بھی کچھ استبعاد باقی نہیں رہتا۔

علم اخلاق کے بعض اصول جن میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور اب بھی چلا جاتا ہے اگر کسی کتاب میں زمانہ حال کے فلسفۂ مسلمہ کے برخلاف ہوں تو اُس پر کچھ اعتراض نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ایسی کوئی کتاب نہیں ہوسکتی جس کی سب باتوں پر تمام عالم کا اتفاق ہو۔ مثلاً شیخ کے اس فقرے پر کہ ''دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز'' اکثر مشنری لوگ یہ کہتے ہیں کہ جھوٹ کیسا ہی مصلحت آمیز ہو سچ کے برابر یا سچ سے بہتر ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اِس بحث کے متعلق ہمارے ایک دوست نے نہایت دلچسپ قصہ نقل کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ ایک علمی سوسائٹی میں چند یوروپین عالم اور مشنری موجود تھے۔ راستی اور دروغ پر ایک مضمون پڑھا گیا۔ جس میں گلستان کے فقرۂ مذکورہ کی تائید کی گئی تھی۔ ایک پادری صاحب نے کہا کہ مضمون عمدہ ہے مگر جس قدر اِس فقرے کی تائید میں لکھا گیا ہے اُس میں سے نکال دینا چاہیے۔ اس پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی مگر کچھ فیصلہ نہ ہوا۔ آخر ہمارے دوست جو اِس قصے کے راوی ہیں اُنھوں نے کھڑے ہوکر کہا کہ اِس بحث کا محاکمہ یوں ہوسکتا ہے کہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے تو بیشک جھوٹ بولنا کسی حالت میں جائز نہیں لیکن اگر جھوٹ سے کسی مظلوم کی جان بچتی ہو تو ایسی حالت میں جھوٹ بولنا بیشک سچ بولنے سے بہتر ہے اس کے بعد اُنھوں نے یہ مثال دی کہ 1857ء میں جو اکثر لوگوں نے رحم اور انسانی ہمدردی کی راہ سے یوروپین عورتوں اور بچوں کو ظالموں اور بے رحموں کی شر سے بچانے کے لیے اپنے گھروں میں چھپالیا تھا اور باغی لوگ اُن کو ڈھونڈتے پھرتے تھے اور ایک ایک سے اُن کا حال پوچھتے تھے ایسی حالت میں جھوٹ بول کر اُن بے گناہوں کو خطرے سے بچانا بیشک سچ بولنے سے بہتر تھا۔ اِس تقریر کو تمام مجلس نے پسند کیا اور وہ فقرہ سب کے اتفاق سے مضمون میں بحال رکھا گیا۔ مذکورہ بالا توجیہ کی تائید خود شیخ کے کلام سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اُس نے گلستان کے آٹھویں باب میں اپنے ذاتی اغراض کے لیے جھوٹ بولنے کو بہت بُرا بتایا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے۔

گر راست سخن گوئی و در بند بمانی بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ ''صورت مفروضہ میں بھی مقتضائے جوانمردی یہی ہے کہ جھوٹ نہ بولا جائے بلکہ ظالموں کا مقابلہ کر کے اپنے تئیں اُن مظلوموں پر نثار کیا جائے جب اپنے میں سے کوئی باقی نہ رہے تب اُن مظلوموں کی باری آئے تو آئے۔'' لیکن ہمارے نزدیک جبھی تک جوانمردی ہے کہ ظالموں کے مقابلہ کرنے یا اپنی جان پر کھیلنے سے اُن بے گناہوں کی جان بچ جانے کا یقین کامل ہو ورنہ یہ حرکت تہور اور نادانی اور سفاہت میں شمار ہوگی۔ اِسی طرح شیخ کے اس شعر کے مضمون پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔

شمشیر نیک ز آہن بد چون کند کسے ناکس بتربیت نشود اے حکیم کس

کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ تعلیم و تربیت اور قانون و مذہب اور تمام سیاستیں عبث اور فضول اور بے کار ہیں۔ مگر یہ مسئلہ کہ تعلیم سے انسان کی جبلت بدل جاتی ہے یا نہیں۔ علم اخلاق کے اُن مسائل میں سے ہے جن کا آج تک کسی قطعی دلیل سے فیصلہ نہیں ہوا۔ انگلستان کے ایک روشن ضمیر مورخ کی رائے ہے کہ حال کی سویلزیشن نے انسان کے اخلاق پر اِس کے سوا کچھ اثر نہیں کیا کہ گناہوں کی صورتیں اور نام بدل گئے ہیں مگر گناہ بدستور موجود ہیں پہلے زمانے میں بیشک گناہ بہت سخت اور شدید اور صریح ہوتے تھے لیکن بہت کم ہوتے تھے اور اب اگرچہ ویسے شدید اور سخت گناہ نہیں ہوتے لیکن نہایت کثرت سے ہوتے ہیں اور چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اِسی لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے اگر پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو بھی انسان اپنی جبلت سے نہیں ٹلتا۔

ایک جگہ شیخ نے کہا ہے کہ ''یہودی کیسا ہی دولت مند ہو جائے شریف نہیں ہو سکتا'' فی الواقع اِس سے کمال تعصب پایا جاتا ہے مگر اس پر کوئی مہذب سے مہذب بھی اعتراض نہیں کر سکتا ہر قوم اپنی حکومت کے زمانے میں محکوم قوم کو ایسا ہی سمجھتی رہی ہے آریا نے ہندستان کے قدیم باشندوں کو اس سے بھی زیادہ حقیر سمجھا تھا۔ مسلمانوں نے بھی اپنے دور میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھا اور انگریز بھی بایں ہمہ شایستگی و تہذیب، نوبلٹی یا شرافت کو اپنی ہی قوم کے ساتھ مخصوص جانتے ہیں۔

ایک اور جگہ گلستان میں لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں ایک مریض بادشاہ کے لیے چند حکماے یونان نے آدمی کا پتہ جو خاص صفات سے موصوف ہو تجویز کیا تھا مگر تجربے کی نوبت

نہیں آئی یہ بات حال کی تحقیقات کے برخلاف بتائی جاتی ہے۔ شاید ایسا ہی ہو۔ مگر شیخ اِس اعتراض سے بری ہے اس کا الزام جو کچھ ہے مجوزین پر ہے۔ نہ اُن کی تجویز کے راوی پر۔ شیخ پر البتہ اُس صورت میں اعتراض ہوسکتا تھا کہ وہ اُن کی تجویز کو پسند کرتا۔ یا یہ لکھتا کہ اُس سے بادشاہ کو شفا ہوگئی۔ یا جو فرض معلّمین اخلاق کا ہے (یعنی ہر قصے اور افسانے سے ایک مفید نتیجہ استخراج کرنا) اُس سے عہدہ برآ نہ ہوتا۔

بعض ملّایانہ اعتراض بھی شیخ کے کلام پر سُنے گئے ہیں۔ مثلاً اُس نے گلستان میں کہا ہے؂

زن بیوہ مکن اگرچہ حور ست　　　ره راست بروا گرچہ دور ست

اِس پر بعض حضرات یہ نقص وارد کرتے ہیں کہ جس امر کی اجازت شریعت سے پائی جاتی ہے اُس سے منع کرنے کے کیا معنی۔ اور بعضے کٹ ملّا بیوہ کی جگہ بَیوہ [1] بتاتے ہیں جس کے معنی اُنھیں کو معلوم ہیں یہ ویسا ہی اعتراض ہے جس پر کسی نے کہا تھا "شعرِ مرا بمدرسہ کہ برد" ظاہر ہے کہ شیخ کی کتاب گلستان کوئی فقہ کا فتاویٰ نہیں ہے کہ جس کی ہر امر و نہی کو ہر امر و نہی مصطلح فقہا پر محمول کیا جائے وہ اکثر اپنے تجربے اور رائے کے موافق جس بات کو بنی نوع کے حق میں مفید سمجھتا ہے اُس کی ترغیب دیتا ہے اور جس کو مضر سمجھتا ہے اُس سے منع کرتا ہے۔ گو فقہانے اُس کو مباح لکھا ہو۔ کیونکہ مباحات میں فعل اور ترک دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے رہی یہ بات کہ شیخ کی رائے فی نفسہ کیسی ہے۔ سو حدیث نبوی سے بھی ابکار کی ترجیح ثیبات پر ثابت ہوتی ہے۔

(2) سب سے زیادہ معقول اعتراض بوستان کی اُس حکایت پر وارد ہوتے ہیں جس میں شیخ نے سومنات کا قصہ لکھا ہے مگر ہم نے اُس کی بابت پہلے باب میں کچھ عذر لکھے ہیں جن سے اعتراض کسی قدر ہلکے ہو سکتے ہیں۔

امرد پرستی کا ذکر جو اِن کتابوں میں اکثر آتا ہے یہ بھی سخت اعتراض کے قابل بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اِس باب میں جو کچھ ہم نے خاتمہ کتاب میں لکھا ہے وہ شاید ان اعتراضوں کے فیصلے کے لیے کافی ہو۔

1- بَیوہ کے معنی لغت میں متجدد اور متغیر ہونے کے لکھے ہیں جو اس شعر میں کسی طرح چسپاں نہیں ہو سکتے۔

ایسے ایسے اعتراضوں سے بجائے اِس کے کہ اِن کتابوں کی قدر و قیمت میں فرق آئے اور زیادہ اُن کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ کپڑا جس قدر اُجلا ہوتا ہے اُسی قدر جلد ذرا سے دھبّے سے میلا ہوتا ہے۔ ان کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہ کتابیں ساڑھے چھ سو برس سے برابر تعلیم میں داخل رہی ہیں اور آج کل بھی کہ نہایت نکتہ چینی کا زمانہ ہے اُسی طرح مشرقی سلسلہ تعلیم کا جزوِ اعظم ہیں اُن کے ایک ایک فقرے اور ایک ایک مصرعے کو نہایت غور سے دیکھا گیا ہے مشنریوں نے صرف اس وجہ سے کہ اِن میں مسلمانوں کی مذہبی باتیں بہت ملی ہوئی ہیں اور ایسے مضامین کا سلسلہ تعلیم میں داخل رہنا مشن کے مقاصد کے خلاف ہے۔ اِن پر نکتہ چینی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا اور گورنمنٹ میں پیش کرنے کے لیے بڑے بڑے طولانی رِویو لکھ کر چھپوائے ہیں۔ نیز اِس لحاظ سے کہ اِن کتابوں کو زیادہ تر صغیر سن بچے پڑھتے ہیں اور بھی زیادہ چھان بین کی گئی ہے۔ باوجود اِن سب باتوں کے ایسے چند سرسری اعتراضوں کا وارد ہونا جیسے کہ اوپر ذکر کیے گئے اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ بلاشبہ اس قدر بے عیب ہیں جس قدر کہ زمانہ متوسط میں انسان کا کلام بے عیب ہوسکتا تھا۔

دوسری عام اور بڑی خوبی جو اِن کتابوں کی خصوصیات میں سے ہے وہ شیخ کا اندازِ بیان ہے جس کا ملکہ اُس کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ یہ بات نہ قواعدِ علمِ بلاغت کی پابندی سے حاصل ہوسکتی ہے اور نہ کسی استاد کی تعلیم سے آتی ہے بلکہ جس طرح حسنِ صورت اور حسنِ صوت قدرتی خوبیاں ہیں اُسی طرح حسنِ بیان بھی ایک جبلّی خاصہ ہے جس میں اکتساب کو چنداں دخل نہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی کمی اور زیادتی پر شاعری کا نقصان اور کمال موقوف ہے۔ جو مطلب اُس کو بیان کرنا ہوتا ہے اُس کے لیے وہ ایسا دلکش اور لطیف پیرایہ ڈھونڈ لاتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں ہوتا۔ مثلاً عربی میں ایک قول مشہور ہے "**الصمت زینة العالم و سِتر الجاھل**" (یعنی خاموشی عالم کی زینت ہے اور جاہل کی پردہ پوش) اِس مطلب کو وہ شعر میں اِس طرح بیان کرتا ہے۔

ترا خامُشی اے خداوند ہوش　　وقارست و نا اہل را پردہ پوش
اگر عالمی ہیبتِ خود مبر　　وگر جاہلی پردۂ خود مَدَر

یا مثلاً اُس کو بیان کرنا ہے کہ جو لوگ نصیحت نہیں سُنتے وہ آخر کو پچھتاتے ہیں یا زک

اُٹھاتے ہیں۔ اس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ہے ''ہر کے نصیحت نشنو د سر ملامت شنیدن دارد'' یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا ہے کہ ہر شے کی قدر اُس کے کم یاب ہونے سے ہوتی ہے۔ اِس کو وہ اس طرح لکھتا ہے ''اگر شبہا ہمہ شب قدر بودے شب قدر بے قدر بودے'' یا مثلاً اُس کو یوں بیان کرتا ہے کہ اپنے سے زیادہ علم والے سے مباحثہ کرنا نادانی ہے۔ اِس کو وہ اِس طرح بیان کرتا ہے ''ہر کہ با داناترے از خود مجادلہ نماید تا بدانند کہ داناست بدانند کہ نادان ست'' یا مثلاً اِس مطلب کو سب پیٹ کی خاطر سختی اُٹھاتے ہیں۔ وہ اِس عنوان سے بیان کرتا ہے ''اگر جورِ شکم نبودے ہیچ مرغ در دام نیفتادے بلکہ صیاد خود دام نہ نہادے'' یا مثلاً یہ بات کہ حاکم رشوت سے دھیما ہو جاتا ہے اس طرح بیان کرتا ہے۔ ''ہمہ کس را دندان بہ ترشی کند گردد مگر قاضیان را بشیرینی'' یا مثلاً اِس مطلب کو کہ ریا کے لیے لذتوں کو ترک کرنا بُرا ہے وہ اس اسلوب سے ادا کرتا ہے ''ہر کہ ترک شہوت از بہر قبولِ خلق دادہ است از شہوت حلال در شہوت حرام اُفتادہ است'' یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا ہے کہ کسی کی آہ و زاری سے قضاے الٰہی نہیں بدلتی اور قانون قدرت نہیں ٹوٹتا۔ اِس کو وہ اِس طرح ادا کرتا ہے۔

قضا دگر نشود در ہزار نالہ و آہ   بہ شکر یا بہ شکایت برآید از دہنے
فرشتۂ کہ وکیل ست بر خزانۂ باد   چہ غم خورد کہ بمیرد چراغ بیوہ زنے

یا اُس کو یہ کہنا ہے کہ اے ریاکار یہ دکھاوے کی عبادت تجھ کو خدا تک نہ پہونچائے گی۔ اِس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ہے۔

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی   کین رہ کہ تو میروی بہ ترکستانست

کبھی وہ ایک نصیحت کے مضمون کو جو اُسے بیان کرنا ہے ایک واقعے کی صورت میں بیان کر کے اُس کو زیادہ پُر تاثیر اور دلنشیں کر دیتا ہے مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا کہ جس طرح ہم سے پہلے لوگ ہزار ہا امیدیں اور ارمان دل میں لیے ہوئے مر گئے اسی طرح ایک روز ہم تم بھی مر جائیں گے اِس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

شنیدم کہ یکبار در دجلۂ   سخن گفت با عابدے کلۂ
کہ من فر فرماندہی داشتم   بسر بہ کلاہ مہی داشتم
سپہرم مدد کرد و نصرت وفاق   گرفتم بباز وے دولتِ عراق

طمع کردہ بودم کہ کرمان خورم ۔۔۔ کہ ناگہ بخوردند کرمان سرم
بکن پنبہ غفلت از گوش ہوش ۔۔۔ کہ از مردگان پندت آید بگوش

اخیر کے شعر سے اُس نے یہ بات جتا دی ہے کہ حقیقت میں کوئی کھوپڑی نہیں بولی تھی بلکہ یہ صرف بیان کرنے کا پیرایہ ہے۔ یا مثلاً اُس کو یہ دکھانا منظور تھا کہ ہر شخص اپنے مذہب کو حق اور دوسرے کے مذہب کو باطل سمجھتا ہے۔ اِس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

یکے جہود و مسلمان خلاف می جستند ۔۔۔ چنانکہ خندہ گرفت از نزاعِ ایشانم
بہ طنز گفت مسلمان گر این قبالۂ من ۔۔۔ درست نیست۔ خدایا جہود میرانم
جہود گفت بہ توریت میخورم سوگند ۔۔۔ وگر خلاف کنم ہمچو تو مسلمانم
گر از بسیطِ زمین عقل منعدم گردد ۔۔۔ بخود گمان نبرد ہیچ کس کہ نادانم

یہ مطلب اگر ایک جلد میں بیان کیا جائے تو بھی اتنا مؤثر اور دلآویز نہیں ہوسکتا جیسا کہ اس پیرائے نے اُس کو دلآویز اور مؤثر کر دیا ہے۔ یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا کہ امن اور عافیت اسی میں ہے کہ انسان لوگوں کے قصے جھگڑوں سے علیحدہ رہے اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دے۔ اِس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

دو کس گرد دیدند و آشوب و جنگ ۔۔۔ پراگندہ نعلین و پرندہ سنگ
یکے فتنہ دید از طرف برشکست ۔۔۔ یکے درمیان آمد و سر شکست
کسے خوشتر از خویشتن دار نیست ۔۔۔ کہ با خوب وزشت کشش کار نیست

یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا منظور تھا کہ جو شخص اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں دخل دیتا ہے وہ ایک بڑی جوابدہی اپنے ذمہ لیتا ہے۔ اِس مطلب کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے۔

آن شنیدی کہ صوفیے می کوفت ۔۔۔ زیرِ نعلین خویش میخے چند
آستینش گرفت سرہنگے ۔۔۔ کہ بیا نعل بر ستورم بند

اِس میں پیرایۂ بیان کے علاوہ صوفی کی تخصیص کرنے سے شوخی اور ظرافت بھی انتہا درجے کی برتی ہے یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا تھا کہ بھیک مانگنا جو ایک مذموم خصلت ہے اس کا الزام صرف فقیروں ہی پر نہیں بلکہ دولت مندوں پر بھی ہے۔ اِس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

"خواہندۂ مغربی در صفِ بزازانِ حلب میگفت اے خداوندان نعمت اگر شمارا انصاف

بودے و مارا قناعت رسم سوال از جہان برخاستے'' یا مثلاً یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ تواضع اور انکسار سے عزت اور مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اُس کو وہ اِس طرح بیان کرتا ہے۔

یکے قطرہ باران زابرے چکید — خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائیکہ دریا ست من کیستم — گر او ہست حقا کہ من نیستم
چو خود را بچشمِ حقارت بدید — صدف در کنارش بجان پرورید
سپہرش بجائے رسانید کار — کہ شد نامور لولوے شاہوار
بلندی بدان یافت کو پست شد — درِ نیستی کوفت تا ہست شد

یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا کہ جس طرح پارسا لوگ رندوں کی صحبت سے منقبض ہوتے ہیں اُسی طرح رند لوگ پارساؤں کی صحبت سے گھبراتے ہیں۔ اِس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

زاہدے درمیانِ رندان بود — زان میان گفت شاہدے بلخی
گر ملولی زما ترش منشین — کہ تو ہم درمیانِ ما تلخی

کبھی وہ اپنے ہی کلام کو اور کا مقولہ قرار دے کر نہایت بامزا کر دیتا ہے جیسے۔

دو یتیم جگر کرد روزے کباب — کہ مے گفت گویندۂ با رباب
دریغا کہ بے ما بسے روزگار — بروید گل و بشگفد نو بہار
بسے تیرودے ماہ اردی بہشت — بیاید کہ ما خاک باشیم و خشت

یا جیسے۔

چو دخلت نیست خرج آہستہ ترکن — کہ میگویند ملاّحان سرودے
اگر باران بکوہستان نبارد — بسالے دجلہ گردد خشک رودے

یا جیسے۔

ہمچنان در فکر آن بیتم کہ گفت — پیلبانے بر لب دریائے نیل
زیر پایت گر بدانی حالِ مور — ہمچو حال تست زیر پاے پیل

یا جیسے۔

چہ خوش گفت با کودک آموزگار   کہ کارے نکردیم و شد روزگار

یا جیسے۔

آن شنیدی کہ شاہدی بہ نہفت   با دل از دست دادۂ می گفت

تا ترا قدر خویشتن باشد   پیش چشمت چہ قدر من باشد

(3) اِن دونوں کتابوں میں یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ باوجودیکہ صنائع لفظی ومعنوی اُن میں کثرت سے موجود ہیں۔ اور تقریباً نصف گلستان کے فقرے مسجع اور مقفیٰ ہیں بااین ہمہ وہ سادگی میں ضرب المثل ہیں اور جہاں نثر عاری کا ذکر آتا ہے وہاں سب سے پہلے گلستان کی مثال دی جاتی ہے۔ فی الواقع یہ شیخ کی کمال انشاپردازی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

شاعر اور منشی جب الفاظ کی زیادہ رعایت کرتا ہے تو اُس کے کلام میں خواہی نخواہی بناوٹ اور تکلف پیدا ہو جاتا ہے اور سررشتہ حسن معنی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ شیخ نے صنائع لفظی ومعنوی کو ایسی خوبصورتی اور سلیقے سے برتا ہے کہ کہیں ساختگی اور تصنّع کا گمان نہیں ہوتا مگر وہ ان عارضی نمایشوں کا ایسا پابند نہیں ہے کہ اُن کے لیے فصاحت و بلاغت سے دست بردار ہو جائے جہاں الفاظ مساعدت کرتے ہیں وہاں ایک ہلکی سی چاشنی اِس کی بھی دے دیتا ہے۔ اُس کی نثر میں مسجع اور مرصّع فقرے سادے فقروں میں ایسے ملے ہوئے ہیں۔ جیسے پشمینے کی شال میں ریشم کے تار۔ جب تک خاص توجہ سے نہ دیکھا جاے تمام فقرے یکساں اور ہموار معلوم ہوتے ہیں البتہ بعض حکایتوں میں اُس نے صنائع لفظی ومعنوی کی زیادہ رعایت کی ہے جیسے ساتویں باب کی اُنیسویں حکایت جس میں اپنا اور ایک شخص کا مناظرہ تونگری اور درویشی کے باب میں لکھا ہے مگر اُس میں بھی الفاظ کو حُسنِ معنی میں خلل انداز ہونے نہیں دیا۔ جس قدر اُس حکایت کے الفاظ میں تناسب اور حسن انتظام پایا جاتا ہے اُس سے زیادہ خیالات میں سنجیدگی اور اصلیت اور واقعیت موجود ہے۔ حکایت مذکور کے چند متفرق فقرے بطور نمونے کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ ''تونگران دخل مسکینا نند۔ وذخیرہ گوشہ نشینان ۔ ومقصد زائران وکہف مسافران۔ ومتحمل بارگران۔ از بہر راحت دگران دست بہ طعام انگہ برند کہ متعلقان وزیردستان بخورند۔ وفضلۂ مکارم ایشان بہ ارامل وایتام

وپیران و اقارب وجیران برسد...... [1] ازمعدہ خالی چہ قوت آید۔ واز دست تہی چہ مروت زاید۔ واز پاے بستہ چہ سرآید۔ واز دستِ گرسنہ چہ خیر...... فراغت با فاقہ نمی پیوندد۔ وجمعیت با تنگدستی صورت نہ بندد۔ یکے تحریمۂ عشا بستہ۔ ودیگرے منتظر عشا نشستہ۔ این بدان کیے ماند...... اشارت خواجۂ عالم بفقر طائفہ ایست کہ مردمیدانِ رضا اند۔ وتسلیم تیر قضا۔ نہ اینان کہ خرقۂ ابرار پوشند ولقمۂ ادرار نوشند...... مشغول کفاف از دولتِ عفاف محروم ست۔ وملک فراغت زیرِ نگین رزق معلوم......۔

......گفت چندان مبالغہ در وصفِ ایشان بکردی۔ وسخنہاے پریشان بگفتی کہ وہم تصور کند تریاقند۔ یا کلید خانہ ارزاق۔ مشتے متکبر ومغرور۔ ومعجب ونفور۔ مشتغل مال ونعمت۔ ومفتتنِ جاہ ثروت۔ سخن نگویند اِلّا بسفاہت ونظر نکنند اِلّا بکراہت۔ علما را بگدائی منسوب کنند۔ وفقرا را بہ بے سروپائی معیوب گردانند۔ بعزت مالے کہ دارند۔ وغیرت جاۓ کہ پندارند۔ برتر از ہمہ نشیتند۔ وخودرا بہتر از ہمہ شناسند۔ نہ آن در سر دارند کہ سر بکسے فرود آرند۔ بیخبر از قولِ حکما کہ گفتہ اند ”ہرکہ بطاعت از دیگران کم ست وبہ نعمت بیش۔ بصورت تونگرست وبمعنی درویش۔ ...... گفتم مذمتِ ایشان روا مدار کہ خداوند کرم اند۔ گفت غلط کردی کہ بندگان درم اند۔ چہ فائدہ کہ ابر آذر رند۔ وبرکس نمی بارند۔ وچشمۂ آفتابند وبرکس نمی تابند۔ وبرمرکب استطاعت سوارند۔ ونمیرانند۔ وقدمے بہر خدا نہ نہند۔ ودرمے بے من واذیٰ ندہند۔ مالے بمشقت فراہم آرند۔ وبہ خست نگہدارند وبہ حسرت بگذارند۔ چنانکہ بزرگان گفتہ اند ”سیم بخیل وقتے از خاک برآید کہ بخیل بہ خاک درآید...... گفتمش بر بخل خداوندان نعمت وقوف نیافتہ اِلّا بعلّتِ گدائی۔ وگرنہ ہر کہ طمع یکسو نہد کریم وبخیلش یکے نماید۔ محک داند کہ زر چیست۔ وگدا داند کہ ممسک کیست۔ ...... محال عقل ست کہ اگر ریگ بیابان دُر شود۔ چشم گدایان پُر شود۔ ...... ہرگز دیدۂ دستِ دعا نے برکف بستہ۔ یا بعلّتِ بینوائی در زندان نشستہ یا پردۂ معصوے دریدہ۔ یا کفے از معصم بریدہ الا بعلّتِ درویشی۔ شیر مردان را بحکم ضرورت در نقب ہا گرفتہ وکعب ہاسفتہ ...... اغلب تہیدستان دامنِ عصمت بمعصیت آلایند وگرسنگان نان مردم ربایند۔

1۔ (......) یہ نشان اس بات کے ہیں کہ یہاں کچھ فقرے چھوڑ دیے گئے ہیں۔

بیت

چون سگِ درندہ گوشت یافت نہ پرسد　　　کین شترِ صالح ست یا خرِ دجال

...... گفتا نہ۔ کہ من بر حال ایشان رحمت می برم۔ گفتم نہ۔ کہ بر مالِ ایشان حسرت میخوری۔ ...... ہر بیذ قے کہ براندے بدفع آن کوشیدے۔ و ہر شاہے کہ بخواندے۔ بفرزین بپوشیدے تا نقد کیسۂ ہمّت در باخت۔ و تیر جعبۂ حجّت ہمہ بینداخت ...... ہر جا کہ گلست خارست و باخمر خمّار۔ و برسرِ گنج مار۔ و آنجا کہ دُرِ شاہوارست۔ نہنگ مردم خوار۔ لذت عیش دنیا رالدغہ اجل در پیش ست۔ ونعیم بہشت را دیوار مکارہ درپیش ...... نظر نہ کنی در بستان کہ بید مشک ست و چوب خشک۔ ہم چنین در زمرۂ تونگران شاکرند و کفور۔ و در حلقۂ درویشان صابرند وضجور۔ ...... مقربانِ حضرتِ حق جل و علا تونگرانند درویش سیرت۔ و درویشانند تونگر ہمت۔ مہین تونگران آنست کہ غمِ درویشان بخورد۔ وبہین درویشان آن کہ کم تونگران گیرد۔ ......نعم طائفہ ہستند بدین صفت کہ بیان کردی۔ قاصرِ ہمّت۔ وکافر نعمت۔ کہ ببرند و بنہند ونخورند وندہند۔ ......قومے برین نمط ہستند کہ شنیدی و طائفۂ خوان نعمت نہادہ و صلاے کرم درداده و میان بخدمت بستہ۔ وابرو بہ تواضع کشادہ طالب نامند ومغفرت۔ و صاحب دنیا وآخرت۔

(4) شیخ اکثر اِن کتابوں میں ایسی حکایتیں لکھتا ہے جن میں باوجود موعظت بلیغ کے کسی قدر ظرافت وخوش طبعی کی بھی گنجایش ہو۔ پھر اپنے حُسنِ بیان سے تمام حکایت کونہایت لطیف وملیح کر دیتا ہے۔ اور کبھی وہ ایک سیدھی سادی حکایت میں کوئی گرم فقرہ یا لطیف کنایہ ایزاد کر کے اُس میں نون مرچ لگا دیتا ہے تاکہ پند وموعظت کی تلخی ظرافت کی چاشنی سے دور ہو جائے۔ چنانچہ گلستان کے خاتمہ میں اُس نے لکھا ہے۔

غالب گفتار سعدی طرب انگیز ست وطیبت آمیز۔ وکوتہ نظران را بدین علت زبانِ طعنہ دراز کہ ''مغز دماغ بیہودہ بُردن ودودِ چراغ بے فایدہ خوردن کار خردمندان نیست۔'' ولیکن بررائے روشنِ صاحبدلان کہ روی سخن در ایشانست پوشیدہ نماند کہ دُرِ موعظتہاے صافی درسلکِ عبارت کشیدہ ست وداروی تلخ نصیحت بشہد ظرافت آمیختہ۔ تا طبع ملولِ انسان از دولت قبول محروم نماند۔'' جوظرافت اُس نے بوستان اور گلستان میں برتی ہے وہ اکثر نہایت

سنجیدہ اور معقول ہے۔ البتہ کہیں کہیں اُس کے قلم سے ایسے الفاظ بھی ٹپک پڑے ہیں جو قانونِ شرم وحیا سے کسی قدر متجاوز ہیں۔ لیکن ایک ظریف طبع اور شوخ مزاج آدمی کا ایسے الفاظ سے بچنا اُسی سوسائٹی میں ممکن ہے جس میں مرد عورت تقریباً تمام جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور جہاں مردوں کو عورتوں کی مجالست اور اُن کے تعلیم یافتہ ہونے کے سبب ہمیشہ تحریر وتقریر میں زبان قابو میں رکھنی پڑتی ہے۔ ورنہ طبیعت کی شوخی ایک ایسی چیز ہے جو بغیر سخت مزاحمت کے کسی طرح رُک نہیں سکتی۔

نکو رو تابِ مستوری ندارد　　　چو در بندی سر از روزن برآرد

اس قسم کی چند حکایتیں مثال کے طور پر یہاں لکھی جاتی ہیں۔

مثال: (1) مہمانِ پیرے بودم در دیارِ بکر کہ مالِ فراوان داشت وفرزندے خوبرو۔ شبے حکایت کرد کہ ''مرا در ہمہ عمر جز این فرزند نبودہ است درختے درین وادی زیارت گاہ است کہ مردمان بحاجت خواستن آنجا روند۔ شبہاے دراز در پائے آن درخت بحق نالیدہ ام تا مرا این فرزند بخشیدہ'' شنیدم کہ پسر با رفیقان ہمی گفت'' چہ بودے اگر من آن درخت را بدانستمے کہ کجاست تا دعا کردمے کہ پدرم زود تر بمیرد'' خواجہ شادی کنان کہ پسرم عاقل ست و پسر طعنہ زن کہ پدرم فرتوت لایعقل۔

قطعہ

سالہا بر تو بگذرد کہ گذر　　　نہ کنی سوے تربتِ پدرت
تو بجائے پدر چہ کردی خیر　　　تا ہمان چشم داری از پسرت

مثال:(2) پیر مردے را حکایت کنند کہ دخترے خواستہ وحجرہ بگل آراستہ وبخلوت با او نشستہ ودیدہٗ ودل درو بستہ۔ شبہاے دراز نخفتے و بذلہا ولطیفہا گفتے باشد کہ موانست پذیرد ووحشت نگیرد۔ بالجملہ شبے مے گفت'' بخت بلندت یار بود وچشم دولت بیدار کہ بہ صحبت پیرے افتادی پختہ، پروردہٗ، جہاندیدہ، آرمیدہ، نیک وبد جہان آزمودہ، سرد وگرم روزگار چشیدہ، کہ حق صحبت بداند وشرط مودت بجا آرد، مشفق ومہربان، خوش طبع وشیرین زبان۔

مثنوی

تا توانم دلت بدست آرم | در بیازاریم نیازارم
ور چو طوطی شکر بود خورِشت | جان شیرین فدائی پرورشت

نہ گرفتار آمدی بدستِ جوانے متعجب، خیرہ رائے، سرتیز، سبک پے، کہ ہردم ہوسے پزد، وہرشب جائے خسپد، وہرروز یارے گیرد۔

قطعہ

جوانان خرم اند و خوب رخسار | ولیکن در وفا با کس نپایند
وفاداری مدار، از بلبلانِ چشم | کہ ہر دم بر گلے دیگر سرایند

برخلاف پیران کہ بہ عقل وادب زندگانی کنند۔ نہ بمقتضائے جہل وجوانی۔

بیت

زخود بہترے جوی وفرصت شمار | کہ با چون خودی گم کنی روزگار

گفت چندان کہ برین نمط بگفتم گمان بردم کہ دلش در قیدمن آمد وصید من شد۔ ناگاہ نفسے سرداز دل پُر درد برآورد وگفت کہ چندین سخن کہ گفتی درترازوئ عقلِ من وزن آن یک سخن ندارد کہ وقتے شنیدہ ام از قابلۂ خویش کہ گفت ''زن جوان راا گر تیرے در پہلونشیند بہ کہ پیرے'' فی الجملہ امکانِ موافقت نبود بمفارقت انجامید۔ چون مدتِ عدتش بسرآمد عقدِ نکاحش بستند با جوانے تند، ترش روے، تہیدست بدخوے، جور جفا میدید، ورنج وعنا میکشید وشکر نعمت حق ہمچنان میگفت: کہ الحمدللہ ازان عذابِ الیم برہیدم وبدین نعمتِ مقیم رسیدم۔

قطعہ

با تو مرا سوختن اندر عذاب | بہ کہ شدن با دگرے در بہشت
بوے پیاز از دہنِ خوبروی | خوب تر آید کہ گل از دست زشت

مثال (3)

مرا حاجیے شانۂ عاج داد | کہ رحمت بر اخلاقِ حجاج باد
شنیدم کہ بارے سگم خواندہ بود | کہ از من بنوعے دلش ماندہ بود
بینداختم شانہ کین استخوان | نمی بایدم دیگرم سگ مخوان

میندار چون سرکۂ خود خورم | کہ جورِ خداوندِ حلوا برم
قناعت کن اے نفس بر اندکے | کہ سلطان و درویش بینی یکے
چرا پیش خسرو بحاجت روی | چو یکسو نہادی طمع خسروی

یہاں پہلی بیت کے دوسرے مصرعے میں **رحمت** کا لفظ کنایتاً بجائے نفرین اور اُس کے مرادف الفاظ کے لایا گیا ہے۔ کیونکہ شعرا کے نزدیک حاجیوں کی سنگدلی، قساوت اور تکبر وغیرہ صفات ذمیمہ مسلّم ہیں۔ چنانچہ گلستان میں بھی شیخ نے ایک جگہ لکھا۔

ازمن بگوے حاجی مردم گزای را | کو پوستین خلق بہ آزار میدرد
حاجی تو نیستی شترست از براے آنکہ | بیچارہ خار میخورد و بار می برد

ایک اور شاعر کہتا ہے۔

چون عالمے کہ دل زدر یخانہ جمع کرد | حاجی ستم بخلق خدا بیشتر کند

پس ظاہر ہے کہ جو شوخی اس کنایہ میں ہے وہ صراحت میں ہرگز ممکن نہ تھی۔ اکثر ناواقف لوگ اِس جگہ رحمت کو اپنے حقیقی معنی پر محمول کرتے ہیں۔ مگر حکایت کا مضمون جس سے رنجش اور شکایت پائی جاتی ہے حقیقی معنی سے آیا کرتا ہے۔

مثال(4) بازرگانے را دیدم کہ صد و پنجاہ شتر بار داشت۔ و چہل بندۂ خدمتگار۔ شبے در جزیرۂ کیش مرا بہ حجرۂ خویش برد۔ و ہمہ شب نیارمید از سخنہاے پریشان گفتن کہ ''فلان انبارم بترکستان ست۔ وفلان بضاعت بہندستان۔ و این قبالۂ فلان زمین ست و فلان مال رافلان کس ضمین۔'' گاہ گفتے کہ خاطر اسکندریہ دارم کہ ہوایش خوش ست۔ و باز گفتے نہ کہ دریاے مغرب مشوش ست۔ سعدیا سفرے دیگر درپیش ست۔ اگر آن کردہ شود بقیّت عمر بگوشۂ بنشینم۔ گفتم آن کدام سفرست۔ گفت ''گوگرد پارسی بہ چین خواہم بردن کہ شنیدم کہ قیمتِ عظیم دارد۔ و ازانجا کاسۂ چینی بروم برم۔ و دیباے رومی بہ ہند۔ و پولاد ہندی بحلب۔ و آبگینۂ حلبی بہ یمن۔ و برد یمانی بپارس۔ ازان پس ترکِ سفر کنم و بدکانے نشینم۔'' چندانے ازین مالخولیا فرو گفت کہ بیش طاقتِ گفتنش نماند۔ گفت سعدی تو ہم سخنے بگواز آنہا کہ دیدی و شنیدی۔ گفتم:

نظم

آن شنیدستی کہ وقتے تاجرے	در بیابانے بیفتاد از ستور
گفت چشمِ تنگِ دنیا دار را	یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

مثال(5):

ملک صالح از بادشاہان شام	برون آمدے صبحدم با غلام
بگشتے در اطرافِ بازار و کوی	برسمِ عرب نیمہ بر بستہ روی
کہ صاحب نظر بود و درویش دوست	ہر آن کین دو دارد ملک صالح اوست
دو درویش در مسجدے خفتہ یافت	پریشان دل و خاطر آشفتہ یافت
شب سردِ شان دیدہ نا بردہ خواب	چو حربا تامّل کنان ز آفتاب
یکے زان دو میگفت با دیگرے	کہ در روز محشر بود داورے
گر این بادشاہانِ گردن فراز	کہ در لہو و عیش اند و با کام و ناز
درآیند با عاجزان در بہشت	من از گور سر بر نگیرم زخشت
بہشتِ برین ملک و ماوای ماست	کہ بندِ غم امروز بر پاے ماست
ہمہ عمر ازینان چہ دیدی خوشی	کہ در آخرت نیز زحمت کشی
اگر صالح آنجا بدیوارِ باغ	در آید بکفشش بدرم دماغ
چو مرد این سخن گفت و صالح شنید	دگر بودن آنجا مصالح ندید
دمے رفت تا چشمۂ آفتاب	ز چشم خلایق فروشست خواب
روان ہر دو کس را فرستاد و خواند	بہ ہیبت نشست و بحُرمت نشاند
بر ایشان بیارید بارانِ جود	فروشست شان گرد ذل از وجود
پس از رنج سرماؤ باران و سیل	نشستند با نامدارانِ خیل
گدایانِ بے جامہ شب کردہ روز	معطر کنان جامہ بر عود سوز
یکے گفت ازینان ملک را نہان	کہ اے حلقہ در گوشِ حکمت جہان
پسندیدگان در بزرگی رسند	زما بندگانت چہ آمد پسند

شہنشہ ز شادی چو گل برشگفت — بخندید در روے درویش و گفت
من آنکس نیم کز غرورِ حشم — ز بے چارگان روے درہم کشم
تو ہم با من از سر بنہ خوی زشت — کہ نا سازگاری کنی در بہشت
من امروز کردم درِ صلح باز — تو فردا مکن در برویم فراز
چنین راہ گر مقبلی پیش گیر — شرف بایدت دست درویش گیر
بر از شاخ طوبیٰ کسے بر نداشت — کہ امروز تخم ارادت نہ کاشت
ارادت نداری سعادت مجوی — بچوگانِ خدمت توان برد گوئی
ترا کے بود چون چراغ التہاب — کہ از خود پُری ہمچو قندیل زاب
وجودے دہد روشنائی بجمع — کہ سوزیش در سینہ باشد چو شمع

(5) وہ اکثر نہایت پاکیزہ اور لطیف نکتے جن سے عموماً اذہان خالی ہوتے ہیں ایسی معمولی اور سرسری باتوں سے نکال لیتا ہے جو عام ذہنوں میں موجود ہوتی ہیں۔

مثال (1): ''ہر نفسے کہ فرو میرود ممدّ حیات ست و چون برمی آید مفرح ذات۔ پس در ہر نفسے دو نعمت موجود ست و بہر نعمتے شکرے واجب''۔ یہ بات کہ داخلی اور خارجی دونوں سانس کی انسان کی زندگی اور تفریح کے باعث ہیں سب کو معلوم تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہر ایک نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ ہر سانس میں خدا کا شکر کرنا واجب ہے۔

مثال (2):

چو طفل اندرون دارد از حرص پاک — چہ مشت زرش پیش و چہ مشت خاک

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ بچہ حرص اور طمع سے پاک ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اُس کو سونے اور مٹی میں کچھ تمیز نہیں ہوتی۔ مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ سونے اور مٹی کو برابر جاننا جو کہ اعلا درجے کے عرفا اور خدا رسیدہ لوگوں کا منصب ہے۔ بچہ کو گویا فقط حرص اور طمع سے پاک ہونے کے سبب حاصل ہے۔ کیونکہ سونے اور مٹی میں کچھ فرق نہ کرنا جبھی تک باقی رہتا ہے جب تک حرص اور طمع پیدا نہیں ہوتی۔ پس ایک شاعر، نہ کہ فلسفی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔

مثال(3):

ازان کز تو ترسد بترس اے حکیم　　وگر با چو او صد برآئی بجنگ
ازان مار بر پاے راعی زند　　که ترسد سرش را بکوبد بسنگ

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کبھی کبھی عاجز اور زبردست بھی زیردستوں پر غالب آجاتے ہیں اور سانپ کا وار بھی کبھی کبھی چرواہے پر چل جاتا ہے۔ مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ جو اپنے سے ڈرے اُس سے ڈرنا چاہیے کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ جو اپنے سے ڈرے اُس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

مثال(4):

دہ کہ گر مردہ باز گردیدے　　بمیانِ قبیلہٗ و پیوند
ردّ میراث سخت تر بودے　　وارثان را ز مرگِ خویشاوند

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ میراث بہت عزیز چیز ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ مرگِ خویشاوند سخت مصیبت ہے مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ اگر مُردہ پلٹ کر آتا تو وارثوں کو میراث کا واپس دینا اُس کے ماتم کے رنج سے زیادہ سخت اور ناگوار ہوتا۔

اِس طرح وہ نہایت سرسری اور معمولی سرگذشتوں سے ایسے نادر اور اچھوتے نتیجے نکال لیتا ہے جو وہم و گمان میں نہیں ہوتے۔ مثلاً یہ کہ میرے باپ نے بچپن میں مجھ کو ایک انگوٹھی پہنا دی تھی۔ ایک روز ایک شخص نے ایک کھجور دے کر مجھ سے وہ انگوٹھی لے لی۔ چونکہ بچہ انگوٹھی کی قدر نہیں جانتا اس لیے ذرا سی مٹھاس کا لالچ دے کر اُس سے لی جاسکتی ہے۔ پس جو لوگ عمر کو عیشِ شیریں میں برباد کر دیتے ہیں شاید وہ عمر کی قدر نہیں جانتے۔ یا مثلاً میں ایک بار عید کے دن باپ کے ساتھ عیدگاہ میں گیا۔ اتفاقاً خلقت کے ہجوم میں باپ سے بچھڑ گیا میں اُسی حالت میں رو رہا تھا کہ باپ نے آ کر دفعتہً میرا کان مروڑا اور فرمایا ''میں نے تجھ کو بارہا کہا کہ میرا دامن پکڑے رہا کر مگر تو نہیں مانتا'' سچ ہے جس طرح انجان بچہ اپنے آپ رستہ نہیں چل سکتا اُسی طرح سالک بغیر مشائخ اور کاملین کی دستگیری کے منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔ یا مثلاً میرے جسم میں کپڑوں کے اندر ایک زخم تھا۔ شیخ علیہ الرحمۃ ہمیشہ پوچھتے تھے کہ کیسا ہے مگر یہ کبھی نہ کہتے تھے کہ کہاں ہے اس سے میں نے جانا کہ ہر عضو کا نام لینا روا نہیں

ہے یا مثلاً ایک شخص نے اپنے بیٹے کے کان اینٹھ کر کہا کہ ''نالایق! میں نے تجھ کو کلہاڑی لکڑیاں چیرنے کو دی تھی، مسجد کی دیوار ڈھانے کو نہیں دی تھی'' اسی طرح زبان ذکر اور شکر کے لیے بنی ہے لوگوں کی غیبت کرنے کے لیے نہیں بنی۔ یا ''ایک شخص مٹی میں سنا ہوا مسجد میں جانے لگا دوسرے نے اُس کو جھڑک دیا کہ خبردار جو مسجد میں قدم رکھا۔'' میرا دل یہ بات سن کر بھر آیا کہ افسوس بہشت میں بھی جو ایک پاک جگہ ہے دامن آلودہ لوگ نہ جاسکیں گے۔

(6) حُسنِ تاویل اور لطفِ استدلال جیسا جچا تُلا اُس کے کلام میں پایا جاتا ہے ایسا اور شعرا کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔

مثال(1):

شنیدم کہ در روزگارِ قدیم — شدے سنگ در دستِ ابدال سیم

نہ پنداری این قول معقول نیست — چو قانع شدی سیم و سنگت یکیست

یعنی یہ جو مشہور ہے کہ اگلے زمانہ میں ابدال کے ہاتھ میں پتھر چاندی ہو جاتے تھے۔ اس میں کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہے کیونکہ جو لوگ قانع ہوتے ہیں اُن کے نزدیک پتھر اور چاندی میں فرق نہیں ہوتا۔ ایک امر خارق عادت کو کس حسنِ بیان کے ساتھ کیسے مختصر لفظوں میں عادت کے موافق ثابت کیا ہے۔

مثال (2):

رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست — بَرِ عارفان جز خدا ہیچ نیست

توان گفتن این باحقائق شناس — ولے خوردہ گیرند اہلِ قیاس

کہ پس آسمان و زمین چیستند — بنی آدم و دام و دد کیستند

پسندیدہ پرسیدی اے ہوشمند — بگویم گر آید جوابت پسند

کہ ہامون و دریاؤ کوہ و فلک — پری آدمی زاد دیو و ملک

ہمہ ہرچہ ہستند زان کمترند — کہ با ہستیش نامِ ہستی برند

عظیم ست پیشِ تو دریا بہ موج — بلند ست گردونِ گردان بہ اوج

ولے اہل صورت کجا پے برند — کہ ارباب معنی بملکے درند

کہ گر آفتاب ست یک ذرہ نیست — وگر ہفت دریاست یک قطرہ نیست

چو سلطانِ عزت علم برکشد　　　جہان سر بجیب عدم درکشد

یہاں اُس نے وحدتِ وجود کے اصلی معنی جو کہ اہل نظر کی سمجھ سے بالاتر تھے نہیں بتائے۔ بلکہ ایک اور معنی جن کو ہر شخص تسلیم کرسکتا ہے نظم میں ایسی لطافت اور خوبی سے بیان کیے ہیں کہ کوئی اور نثر میں بھی مشکل سے بیان کرسکتا۔

مثال(3):

نگہدار فرصت کی عالم دمی ست　　　دمے پیشِ دانا بہ از عالمے ست

سکندر کہ بر عالمے حکم داشت　　　دران دم کہ بگذشت و عالم گذاشت

میتر نبودش کزو عالمے　　　ستانند و فرصت دہندش دمے

یہاں اُس نے دو متضاد دعوے کیے ہیں۔ ایک یہ کہ عالم ایک سانس کا نام ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک سانس عاقل کے نزدیک عالم سے بہتر ہے۔ پھر دونوں دعووں کو ایک دلیل سے ثابت کیا ہے۔ کیونکہ جب ایک سانس کے نہ آنے سے تمام عالم سکندر کے ہاتھ سے جاتا رہا تو معلوم ہوا کہ اُسی سانس کا نام عالم تھا اور جب کہ ایک سانس اُس کو تمام عالم کے عوض میں نہ مل سکا تو معلوم ہوا کہ ایک سانس تمام عالم سے بہتر تھا۔ یہ غایت درجے کا حسنِ استدلال ہے کہ دو متضاد دعوے ایسی شگفتہ بیانی اور اختصار اور صفائی کے ساتھ ایک ہی دلیل سے ثابت کیے جائیں اور حسنِ شعری بھی ہاتھ سے نہ جائے۔

(7) نیچر کے بیان میں شیخ کا کلام فی الواقع لاثانی ہے۔ خدا کی صنعت اور حکمت کے متعلق وہ وہی باتیں بیان کرتا ہے جو سب جانتے ہیں لیکن یہ کسی کی طاقت نہیں کہ اُن کو ویسے پاکیزہ اور دلنشیں بیان کے ساتھ ادا کر سکے۔ اُس کے نیچرل بیان پر غالب مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

شعر

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا　　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مثال(1):

گر از حق نہ توفیق خیرے رسد　　　کے از بندہ خیرے بہ غیرے رسد

زبان را چہ بینی کہ اقرار داد　　　بہ بین تا زبان را کہ گفتار داد

درِ معرفت دیدۂ آدمی ست | کہ بکشادہ بر آسمان و زمی ست
کیت فہم بودے نشیب و فراز | گر این در نکردے بروے تو باز
سر آورد و دست از عدم در وجود | درین جود بنہاد در وے سجود
وگر نہ کے از دست جود آمدے | محالست کز سر سجود آمدے
بحکمت زبان داد و گوش آفرید | کہ باشد صندوقِ دل را کلید
اگر نہ زبان قصہ برداشتے | کس از سرِ دل کے خبر داشتے
وگر نیستے سعی جاسوسِ گوش | خبر کے رسیدے بسلطانِ ہوش
مرا لفظ شیرین خوانندہ داد | ترا سمع درّاک دانندہ داد
مدام این دو چون حاجبان بردر اند | ز سلطان بہ سلطان خبر می برند
چہ اندیشی از خود کہ فعلم نکوست | ازان در نگہ کہ تقدیر او ست
برد بوستان بان بہ ایوانِ شاہ | بہ تحفہ ثمر ہم ز ایوانِ شاہ

اِس نظم میں اُس نے یہ بات بیان کی ہے کہ بدون خدا کی توفیق کے آدمی سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ اور زبان، کان، آنکھ، سر اور ہاتھ جن ظاہری اغراض کے لیے پیدا کیے گئے ہیں وہ اغراض بیان کیے ہیں۔ یہ تمام باتیں کم وبیش ہر شخص کو معلوم ہوتی ہیں مگر جس ترتیب سے شیخ نے اُن کو بیان کیا ہے اُس کے لحاظ سے تمام مضمون نرالا معلوم ہوتا ہے۔ اخیر بیت میں انسان کی بندگی اور عبادت کو باغبان کی ڈالی سے جو کہ بادشاہ ہی کے باغ میں سے بادشاہ کے لیے لگا کر لے جاتا ہے تمثیل دے کر مضمون کا حسن انتہا کو پہونچا دیا ہے۔

مثال (2):

دو صد مہرہ در یکدگر ساختست | کہ گل مہرۂ چون تو پرداختست
رگت در تنست اے پسندیدہ خوی | زمینے درو سیصد و شصت جوے
بصر در سر و فکر و راے و تمیز | جوارح بدل دل بدانش عزیز
بہائم برد اندر افتادہ خوار | تو ہمچون الف بر قدمہا سوار
نگون کردہ ایشان سر از بہر خور | تو آری بعزت خورش پیشِ سر

نہ زیبد ترا با چنین سروری | کہ سر جز بطاعت فرود آوری

مثال (3):

شب از بہر آسائش تست و روز | مہ روشن و مہر گیتی فروز
صبا از برائے تو فراش دار | ہمے گستراند بساطِ بہار
اگر باد و برفست و باران و میغ | وگر رعد چوگان زند برق تیغ
ہمہ کارورانِ فرمان برند | کہ تخم تو در خاک مے پرورند
وگر تشنہ مانی ز سختی مجوش | کہ سقاے ابر آبت آرد بدوش
ز خاک آورد رنگ و بوے و طعام | تماشا گو دیدۂ و مغز و کام
عسل دادت از نحل و من از ہوا | رطب دادت از نخل و نخل از نوا
ہمہ نخلبندان بخایند دست | ز حیرت کہ نخلے چنین کس نہ بست
خور و ماہ پروین براے تو اند | قنادیل سقفِ سراے تو اند
ز خارت گل آورد و از نافہ مشک | زر از کان و برگِ تر از چوب خشک
بدستِ خودت چشم و ابرو نگاشت | کہ محرم بہ اغیار نتوان گذاشت
توانا کہ آن نازنین پرورد | بالوانِ نعمت چنین پرورد
بجان گفت باید نفس بر نفس | کہ شکرش نہ کار زبان ست و بس

(8) وہ اکثر قانونِ قدرت سے اشیا کے حُسن و قبح اور اصول اخلاق کے ثبوت پر استدلال کرتا ہے اور ایسا استدلال ہمیشہ دیگر اقسام استدلال کی نسبت زیادہ دلنشیں اور عام فہم ہوتا ہے کلامِ الٰہی میں بھی مبدا و معاد کے ثبوت پر زیادہ تر اسی قسم کا استدلال کیا گیا ہے۔

مثال(1):

پلیدی کند گربہ بر جاے پاک | چو زشتش نماید بپوشد بہ خاک
تو آزادی از نا پسندیدہا | نترسی کہ بروے فتد دیدہا

بلّی کو جو قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ وہ جہاں کہیں بول و براز کرتی ہے اُس کو فوراً مٹی سے ڈھانک دیتی ہے۔ اس سے وہ اس بات پر استدلال کرتا ہے کہ بُرے اعمال کو ہمیشہ

لوگوں سے چھپانا چاہیے جو ایسا نہیں کرتے وہ ایک جانور کی برابر بھی سمجھ نہیں رکھتے۔

مثال (2):

حلم شتر چنانکہ معلوم ست اگر طفلے مہارش گیرد و صد فرسنگ ببرد گردن از متابعتِ او نہ پیچد۔ اما اگر راہے ہولناک پیش آید کہ موجب ہلاک باشد و طفل آنجا بنادانی خواہد رفتن زمام از کفش در گسلاند۔ و بیش متابعت نکند کہ ہنگام درشتی ملاطفت مذموم ست۔

قطعہ

کسیکہ لطف کند با تو خاک پایش باش	وگر ستیزہ کند در دو چشمش افگن خاک
سخن بلطف و کرم با درشت خوی مگوی	کہ زنگ خوردہ نگردد مگر بسوہن پاک

یہاں اُس کو یہ سوجھانا منظور تھا کہ نرمی وہیں تک پسندیدہ ہے جہاں تک دوسری طرف سے درشتی اور سختی اور اپنی مضرت کا احتمال نہ ہو ورنہ مذموم ہے۔ اس مطلب پر وہ یہ دلیل لایا ہے کہ اونٹ کو بھی قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہیں ہوتا ایک بچہ اُس کی نکیل پکڑ کر جہاں تک چاہتا ہے لے جاتا ہے مگر جہاں کچھ خوف ہوتا ہے وہاں اُس کی اطاعت نہیں کرتا اور رسّی توڑا کر بھاگ جاتا ہے۔

مثال(3):

برہ بر یکے پیشم آمد جوان	بہ تگ در پَیَش گوسفندے دوان
بدو گفتم این ریسمانست و بند	کہ مے آرد اندر پَیَت گوسفند
سبک طوق و زنجیر ازو باز کرد	چپ و راست پوئیدن آغاز کرد
برہ در پَیَش ہمچنان میدوید	کہ جو خوردہ بود از کفِ مرد خوید
چو باز آمد از عیش و بازی بجاے	مرا دید و گفت اے خداوندراے
نہ این ریسمان میبرد با منش	کہ احسان کمندیست در گردنش
بہ لطفے کہ دیدست پیل دمان	نیارد ہمے حملہ بر پیلبان
بدان را نوازش کن اے نیک مرد	کہ سگ پاس دارد چو نانِ تو خرد
بران مرد کُند ست دندانِ یوز	کہ مالد زبان بر پنیرش دو روز

یہاں اُس کو یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ جس قدر تم لوگوں کے ساتھ احسان اور بھلائی

کروگے اُسی قدر لوگ تمھارے دوست اور خیر خواہ و جان نثار ہوں گے۔ اس پر وہ یہ دلیل لایا ہے کہ بکری، ہاتھی، کتا، چیتا اور اسی طرح تمام حیوانات کو قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ جو شخص اُن کی پرورش کرتا ہے اور اُن کو کھلاتا پلاتا ہے وہ اُسی کا دم بھرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ وحشیوں میں وحشت اور درندوں میں سبعیت باقی نہیں رہتی۔

(9) وہ کبھی فقیہانہ اور واعظانہ نصیحتیں جو اکثر تلخ اور بے مزا اور سامعین کے دل پر گراں ہوتی ہیں، اُنہیں بلکہ اکثر آزادانہ اور محققانہ نصیحتیں کرتا ہے جو اگرچہ عام خیالات سے کسی قدر بلند ہوتی ہیں۔ لیکن حدِّ شرع سے ہرگز متجاوز نہیں ہوتیں اور اس لیے اُن کو زاہد اور رند دونوں پسند کرتے ہیں۔

مثال(1):

بسرہنگ سلطان چنین گفت زن — کہ خیز اے مبارک درِ رزق زن
برو تا زخوانت نصیبے دہند — کہ فرزندگانت بہ سختی درند
بگفتا بود مطبخ امروز سرد — کہ سلطان بشب نیت روزہ کرد
زن از ناامیدی سر انداخت پیش — ہے گفت با خود دل از فاقہ ریش
کہ سلطان ازین روزہ گوئی چہ خواست — کہ افطار او عید طفلانِ ما ست
خورندہ کہ خیرش بر آید زدست — بہ از صائم الدہر دنیا پرست
مسلّم کسے را بود روزہ داشت — کہ درماندۂ را دہد نانِ چاشت
وگر نہ چہ حاجت کہ زحمت بری — ز خود باز گیری و ہم خود خوری

مثال(2):

شنیدم کہ مردے براہ حجاز — بہر خطوہ کردے دو رکعت نماز
چنان گرم رو در طریق خدائے — کہ خار مغیلان نہ کندے ز پائے
بآخر ز وسواسِ خاطر پریش — پسند آمدش در نظر کارِ خویش
بہ تلبیسِ ابلیس در چاہ رفت — کہ نتوان ازین خوبتر راہ رفت
گرش رحمتِ حق نہ دریافتے — غرورش سر از جادہ بر تافتے
یکے ہاتف از غیب آواز داد — کہ اے نیکبختِ مبارک نہاد

مپندار گر طاعتے کردۂ | کہ نزلے درین حضرت آوردۂ
بہ احسانے آسودہ کردن دلے | بہ از الف رکعت بہر منزلے

(10) جب اُس کو کسی خاص فرقہ یا جماعت کے واقعی عیوب بیان کرنے ہوتے ہیں تو اُن کو ایسے عمدہ پیرایوں میں بیان کرتا ہے کہ کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً اُس کو یہ منظور تھا کہ امرا اور دولت مندوں کو اُن کے عیوب سے مطلع کرے تو اُس نے اِس مطلب کو صاف صاف نہیں لکھا بلکہ ایک فرضی مناظرہ اور ایک اور شخص کا جس میں اپنے تئیں امرا کا طرفدار اپنے حریف کو فقرا اور درویشوں کا حمایتی قرار دیا ہے لکھ کر تمام دل کے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ طرفِ ثانی امیروں کی برائیاں اور درویشوں کی خوبیاں بیان کرتا ہے اور شیخ اُس کی تقریر کو رد کر کے امرا کی خوبیاں اور درویشوں کی بُرائیاں ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح اُس نے تمام سلاطین عہد اور وزرا اور اُمرا کی خاطر خواہ خبر لی ہے۔ چنانچہ گلستان کے ساتویں باب میں یہ مناظرہ موجود ہے یا مثلاً اُس کو مشائخ و زہاد کی قلعی کھولنی منظور تھی اِس مضمون کو اُس نے کھلم کھلا ادا نہیں کیا بلکہ ایک قصہ جو بوستان کے چوتھے باب میں مذکور ہے نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ایک شوخ چشم سائل کسی بزرگ کے دروازے پر بھیک مانگنے گیا۔ صاحب خانہ کے پاس اُس وقت کچھ نہ تھا اس لیے کچھ نہ دیا۔ سائل نے ڈیوڑھی سے ذرا پرے ہٹ کر اُس کی اور اُس کے ساتھ تمام فقرا اور تمام مشائخ کی تفضیح اور توہین کرنی شروع کی اور خوب دل کے بخارات نکالے۔ جتنے واقعی عیب اکثر ان لوگوں میں ہوتے ہیں سب ظاہر کر دیے۔ جب شیخ صاحب اُن کے پترے کھول چکے تو سائل کے بیان کو اپنے اِس مقولے پر ختم کرتے ہیں۔

نخواہم درین باب ازین بیش گفت | کہ شنعت بود سیرت خویش گفت

یعنی میں اِس باب میں اِس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا ورنہ وہی مثل ہوگی ''اپنا گھٹنا کھولے اور آپ ہی لاجوں مرے۔'' کیونکہ آپ بھی اُسی گروہ میں سے ہیں پھر اُس بزرگ کی تواضع اور تحمل اور حلم کا بیان کیا ہے کہ باوجود ایسی زبان درازیوں کے اُس نے کچھ بُرا نہ مانا اور اُس کے گمان سے زیادہ اپنے عیبوں کا اقرار کیا۔

(11) یہ بات عموماً دیکھی گئی ہے کہ جو واقعات اسلاف سے نقل کیے جاتے ہیں وہ

اتنے موثر نہیں ہوتے جتنا کہ اپنی سرگذشت اور روداد کا بیان موثر ہوتا ہے بشرطیکہ بیان کرنے والا نہایت فصیح و بلیغ اور اپنے جذبات ادا کرنے پر قادر ہو کیونکہ جو روایت ایک واسطے سے سُنی جاتی ہے اُس کا یقین بہ نسبت اُس روایت کے زیادہ ہوتا ہے جو متعدد واسطوں سے سُنی جائے۔ دوسرے ناقل اپنی سرگذشت کو بہ نسبت اخبار ماضیہ کے زیادہ پُرجوش الفاظ میں بیان کرسکتا ہے۔ گلستان اور بوستان میں چونکہ شیخ نے زیادہ تر اپنے ہی واقعات لکھے ہیں اور اُن سے نتائج استخراج کیے ہیں اس لیے اُن کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور ناظرین کو زیادہ پسند آتے ہیں خصوصاً اِس وجہ سے کہ شیخ جیسا جادو بیان اُن کو بیان کرتا ہے ایسی مثالوں سے دونوں کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مثال(1):

بہ صنعا درم طفلے اندر گذشت — چہ گویم کزانم چہ بر سر گذشت
قضا نقشِ یوسف جمالے نکرد — کہ ماہی گورش چو یونس نخورد
درین باغ سروے نیامد بلند — کہ باد اجل بیخش از بُن نکند
عجب نیست بر خاک اگر گل شگفت — کہ چندین گل اندام در خاک خفت
بدل گفتم اے ننگ مردان بمیر — کہ کودک رود پاک و آلودہ پیر
ز سودا و آشفتگی بر قدش — برانداختم سنگے از مرقدش
ز ہولم دران جائے تاریک و تنگ — بشورید حال و بگردید رنگ
چو باز آمدم زان تغیر بہوش — ز فرزندِ دلبندم آمد بگوش
گرت وحشت آمد ز تاریک جاے — بہُش باش و با روشنائی درائے
شب گور خواہی منور چو روز — ازینجا چراغ عمل بر فروز
تن کارکن می بلرزد ز تب — مبادا کہ نخلش نیارد رُطب
گروہے فراوان طمع ظن برند — کہ گندم نیفشاندہ خرمن برند
برآن خورد سعدی کہ بیخے نشاند — کسے بُرد خرمن کہ تخمے نشاند

(12) جب اُس کو کسی نیک کام کی ترغیب دینی ہوتی ہے تو ایسے غریب اور اجنبی مباحث پیش نہیں کرتا جو لوگوں کے خیالات میں بہت کم گزرتے ہیں بلکہ ایسی معمولی باتیں یاد

دلاتا ہے جواُس کام کی نسبت ہمیشہ خاص و عام کے دل میں گزرتی ہیں اور اُن کی آنکھوں کے سامنے پیش آتی رہتی ہیں۔ اور جب کسی امر پر اُس کو متنبہ کرنا منظور ہوتا ہے تو ایسے صاف اور صریح نتیجے سجھاتا ہے جو دنیا میں ہمیشہ دیکھے جاتے ہیں۔ وہ کوئی نئی بات نہیں سکھاتا بلکہ بھولی ہوئی باتوں کو یاد دلاتا ہے یہی سبب ہے کہ اُس کے بیان کی طرف خود بخود لوگوں کے دل کھنچتے ہیں اور اُس کے کلام میں ایسا مزہ آتا ہے جیسے کوئی مدت کی کھائی ہوئی لذیذ چیز برسوں کے بعد سامنے آتی ہے اور نہایت رغبت اور شوق سے کھائی جاتی ہے۔

مثال (1):

پدر مردہ را سایہ بر سر فگن — غبارش بیفشان و خارش بکن
چو بینی یتیمے سرافگندہ پیش — مدہ بوسہ بر روئے فرزندِ خویش
یتیم ار بگرید کہ نازش خرد — وگر خشم گیرد کہ بارش برد
اَلا تا نگرید کہ عرش عظیم — بلرزد ہے چون بگرید یتیم
برحمت بکن آبش از دیدہ پاک — بہ شفقت بیفشانش از چہرہ خاک
اگر سایۂ او برفت از سرش — تو در سایۂ خویشتن پرورش
من آنگہ سر تاجور داشتم — کہ سر در کنار پدر داشتم
اگر بر وجودم نشستی مگس — پریشان شدے خاطر چند کس
کنون گر بزندان برندم اسیر — نباشد کس از دوستانم نصیر
مرا باشد از دردِ طفلان خبر — کہ در طفلی از سر برفتم پدر

مثال (2):

پسر چون زدہ برگذشتش سنین — ز نامحرمان گو فراتر نشین
بر پنبہ آتش نشاید فروخت — کہ تا چشم برہم زنی خانہ سوخت
چو خواہی کہ نامت بماند بجائے — پسر را خردمندی آموز و رائے
کہ گر عقل و رایش نباشد کسے — بمیری و از تو نماند کسے
بسا روزگارا کہ سختی برد — پسر چون پدر نازکش پرورد
خردمند و پرہیزگارش برار — گرش دوست داری بنازش مدار

به خُردی درش زجر و تعلیم کن — به نیک و بدش وعدهٔ و بیم کن
نو آموز را ذکر تحسین و زه — ز توبیخ و تهدید استاد به
بیاموز پرورده را دست رنج — وگر دست داری چو قارون به گنج
مکن تکیه بر دستگاہے که ہست — که باشد که نعمت نماند بدست
بپایان رسد کیسهٔ سیم و زر — نگردد تہی کیسهٔ پیشه ور
چه دانی که گزدیدنِ روزگار — بغربت بگرداندش در دیار
چو بر پیشهٔ باشدش دسترس — کجا دستِ حاجت برد پیش کس
ندانی که سعدی مکان از چه یافت — نه ہامون نوشت و نه دریا شگافت
به خُردی بخورد از بزرگان قفا — خدا دادش اندر بزرگی صفا
ہرآن طفل کو جور آموزگار — نه بیند، جفا بیند از روزگار
پسر را نکو دار و راحت رسان — که چشمش نماند بدستِ کسان
ہر آن کس که فرزند را غم نخورد — دگر کس غمش خورد و آواره کرد
نگہدار از آمیزگارِ بدش — که بدبخت و بے ره کند چون خودش
پسر کو میانِ قلندر نشست — پدر گو ز خیرش فرو شوئے دست
دریغش مخور بر ہلاک و تلف — که پیش از پدر مرده به نا خَلف

یہ خصوصیتیں جو گلستان اور بوستان میں ہم نے بتائی ہیں زیادہ غور کرنے سے اور بھی بہت سی باتیں ایسی نکل سکتی ہیں جو اِن کتابوں کی مزید شہرت اور قبولیت کا باعث ہوئی ہیں مگر ہم انھیں پر اقتصار کر کے اب شیخ کی غزلیات پر نظر ڈالتے ہیں۔

غزلیاتِ شیخ

غزلیات کی ترتیب کا طریقہ جو فی زماننا فارسی اور اُردو دیوانوں میں مروّج ہے اِس طریقے پر غالباً سب سے اوّل شیخ ہی کا دیوان مدوّن کیا گیا ہے کیونکہ شیخ سے پہلے کے بعض دیوان غزلیات مثل خاقانی وغیرہ اب تک مجموعۂ قصائد کی طرح غیر مرتب اور پراگندہ طور پر لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

علی بن احمد بے ستون جامع کلیات شیخ نے اول ہر غزل کے مطلع کا حرف لے کر شیخ کے تمام دیوان بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیے تھے۔ آخر اِس ترتیب میں یہ قباحت نکلی کہ جس غزل کا مطلع معلوم نہ ہو اُس کا دیوان میں ملنا دشوار تھا۔ چنانچہ شیخ کی وفات کے بیالیس برس بعد اُس نے دوبارہ شیخ کے سب دیوان موجودہ طریقے پر مرتب کیے اور پھر یہ ترتیب عموماً جاری ہوگئی۔

شیخ کی غزلیات کے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا چار دیوان ہیں جن میں سب سے بڑا دیوان موسوم بہ طیبّات ہے۔ باقی تین دیوان اِس سے چھوٹے ہیں اگر چہ اِن میں بعض دیوان ابتدائے عمر کے اور بعض سنِ کہولت اور پیری کے زمانے کے ہیں۔ مگر شیخ کا انداز بیان ابتدا ہی سے تغزل میں ایسا صاف اور سلیس ہے کہ چاروں دیوانوں میں باعتبار صفائی اور سلاست کے بہت کم تفاوت محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کے کلام میں ہمیشہ صفائی اور گھلاوٹ ایک مدت کی مشق ومہارت کے بعد آتی ہے۔ عنفوان شباب کا کلام ویسا صاف اور شستہ نہیں ہوتا جیسا سنِ کہولت اور بڑھاپے کا ہوتا ہے مگر شیخ کا کلام اِس سے مستثنیٰ ہے۔ البتہ طیبّات اور بدائع جو جوانی اور کہولت کے زمانے کے دیوان ہیں اُن میں اور دیوانوں کی نسبت خیالات کی نزاکت اور زور بیان زیادہ پایا جاتا ہے۔

شیخ کے دیوان کو اکثر تذکرہ نویسوں نے نمکدانِ شعرا لکھا ہے اگر چہ اِس سے پہلے

انوری و خاقانی و ظہیر وغیرہ کی غزلیات موجود تھیں اور قدما کے قصائد میں بھی مثل متاخرین کے اکثر تشبیبوں میں تغزل یعنی عاشقانہ اشعار ہوتے تھے۔ مگر اُس وقت غزل میں یہ لذت نہ تھی جو شیخ نے اپنی جادو بیانی سے پیدا کی پہلے شاعری کا مدار زیادہ تر قصیدے اور مثنوی پر تھا۔ بعضے دو بیتی (یعنی رباعی) اور قطعے کے سوا اور کچھ نہ کہتے تھے۔

شیخ نے غزل کو ایسا رنگین اور بامزہ کر دیا کہ لوگ قصیدے اور مثنوی کو چھوڑ کر غزل پر ٹوٹ پڑے۔ غزل گویوں کے نام یا تو اُنگلیوں پر گنے جا سکتے تھے یا لاکھوں سے متجاوز ہو گئے اسی واسطے بعض شعرا نے شیخ کو غزل کا پیمبر کہا ہے۔ مگر کلام کی نمکینی اور شیرینی محض وجدانی کیفیتیں ہیں جو بدون ذوقِ سلیم کے ہرگز معلوم نہیں ہوسکتیں۔ پس صرف یہ کہہ دینا کہ اُس کا دیوان نمکدانِ شعرا ہے یا وہ غزل کا پیمبر ہے اُنھیں کے لیے کافی ہے جو شعر کا پورا پورا انداق رکھتے ہیں اُن کے سوا اور لوگ جب تک کوئی صریح مابہ الامتیاز شیخ اور قدما کی غزل میں بیان نہ کیا جائے یہ نہیں سمجھ سکتے کہ شیخ کی غزل کو کیا فوقیت ہے۔ لیکن وجدانیات میں فرق بتانا کچھ آسان کام نہیں ہے۔

میں نے شیخ اور انوری و خاقانی و ظہیر کی غزلیات کو صرف اس غرض سے دیکھا کہ وہ تفاوت جو شیخ اور قدما کی غزلیات میں ہے صاف صاف معلوم ہو۔ مجھ کو چند باتیں شیخ کے دیوان میں ایسی ملی ہیں جو قُدما کے کلام میں یا تو بالکل نہیں یا بہت کم پائی جاتی ہیں میرے نزدیک یہی وہ خصوصیتیں ہیں جنھوں نے غزل کو نہایت بامزا اور لطف انگیز اور مرغوب طبائع خاص و عام کر دیا ہے۔

(1) شیخ اکثر غزل کی بحر اور زمین ایسی اختیار کرتا ہے جو تغزل اور تغنی کے واسطے بہت مناسب ہوتی ہے۔ نظم میں سب سے بڑا کرشمہ جو کہ اکثر اُس کو نثر سے زیادہ دلفریب اور دلکش کر دیتا ہے وزن اور قافیہ ہے۔ پس ظاہر ہے کہ شگفتہ زمین اور مضمون کے مناسب وزن اختیار کرنے سے نظم کی دلفریبی زیادہ ہو جائے گی۔ اسی لیے شیخ کی غزلیات ابتدا سے وجد و سماع کی مجلسوں میں گائی جاتی تھیں۔ علی بن احمد جامع کلیات شیخ جس نے شیخ سے 42 برس بعد اس کا کلام جمع کیا۔ اپنا مشاہدہ لکھتا ہے کہ ایک جگہ رات کو مجلس سماع منعقد تھی جس میں شیخ کی یہ غزل گائی گئی تھی۔

نظر خدای بینان زسرِ ہوا نباشد سفر نیازمندان ز رہ خطا نباشد

مجلس کے خاص و عام جابجا بے ہوش اور از خود فراموش پڑے تھے اور مجلس کے برخاست ہونے کے بعد سب کا اس بات پر اتفاق تھا کہ مدتِ عمر میں ایسا سماع نہیں دیکھا۔ میں کہتا ہوں کہ ایک بار میں نے بھی ایک بزرگ کو جو سماع سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے شیخ کے ایک مطلع پر جو قوآل نے بے مزامیر کے اُن کے سامنے گایا تھا دیکھا کہ اُن کا تمام بدن کانپنے لگا تھا اور آنکھوں سے برابر آنسو جاری تھے اور یہ کیفیت اُن پر بہت دیر تک طاری رہی تھی وہ مطلع یہ تھا۔

اے کہ آگاہ نۂ عالمِ درویشان را تو چہ دانی کہ چہ سودا سرست ایشان را

(2) شیخ کی غزل کو اُس جبلّی عشق و محبت نے جو اُس کی بات بات سے ٹپکتی ہے اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا۔ عرب اور عجم کے تمام شعرا جو عاشق مزاج ہوئے ہیں ان کی تشبیب اور تغزل میں ایک خاص حالت پائی جاتی ہے۔ جو اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ شیخ ایک جگہ خود فرماتے ہیں ''آنکہ نشنید ست ہرگز بوئے عشق۔ گو بشیراز آو خاکِ ما بوی''۔ یہی سبب ہے کہ وہ حسن و عشق، وصل و جدائی، یاس و امید، صبر و مجبوری، وعدہ و انتظار اور دیگر لوازم عشق کی جو کیفیتیں بیان کرتا ہے اُن میں بالکل تصنع نہیں پایا جاتا اور وہ سب ایسی باتیں ہوتی ہیں جو اُس عالم میں ہر شخص پر گزرتی ہیں۔ اسی واسطے عشاق کے دل پر اُن کا زیادہ اثر ہوتا ہے ایسے اشعار سے شیخ کے چاروں دیوان بھرے پڑے ہیں۔ مگر چند شعر بطور نمونے کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

مقدار یار ہم نفس چون من نداند ہیچکس ماہی کہ در خشک اوفتد قیمت بداند آب را

ایکہ گفتی ہیچ مشکل چون فراق یار نیست گر اُمید وصل باشد آنچنان دشوار نیست

ہر کو ہمہ عمرش سودائے گلے بودہ ست داند کہ چرا بلبل دیوانہ ہمے باشد

دل و جانم بتو مشغول ونگہ بر چپ و راست تا ندانند رقیبان کہ تو منظور منی

دیگران چون بروند از نظر از دل بروند تو چنان در دلِ من رفتہ کہ جان در بدنے

گفتہ بودم کہ رخت بربندم تا رہِ بصرہ گیرم و بغداد

دست از دامنم نمے دارد خاک شیراز و آبِ رُکناباد

ہزار جہد بکردم کہ سرِ عشق بپوشم | نبود بر سرِ آتش میسّرم کہ بجوشم
بہ زخم خورد حکایت کنم ز دستِ جراحت | کہ تندرست ملامت کند چو من بخروشم
نفحاتِ صبح دانی ز چہ روی دوست دارم | کہ بروی دوست ماند کہ برافگند نقابے
بروائے گدای مسکین ودرِ دگر طلب کن | کہ ترا بارا گفتی و نیامدت جوابے
شربتے تلخ تر از درد فراقت باید | تا کند لذّتِ وصلِ تو فراموش مرا
بر عندلیبِ عاشق گر بشکنی قفس را | از ذوقِ اندرونش پروائے در نباشد
برقِ یمانی بجست بادِ بہاری بخاست | طاقت مجنون نماند خیمۂ لیلیٰ کجاست

(3) اکثر وہ ایسے شعر کہتا ہے جن سے مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص موقع ہے اور وہاں جو حالت اُس نے آنکھوں سے دیکھی ہے یا جو کیفیت اُس کے دل پر گزری ہے اُس کو بیان کر رہا ہے۔ اس قسم کے اشعار اکثر ایسے موقعوں پر جہاں اُسی طرح کی کیفیت پیش آتی ہے نہایت مزا دیتے ہیں مثلاً ؎

ای روبہک چرا نہ نشستی بجای خویش | با شیر پنجہ کردی و دیدی سزاے خویش
ساربان آہستہ ران کارامِ جان در محمل است | اشتران را بار بر پشت ست و ما را بر دل ست
چہ رویست اینکہ پیش کاروان ست | مگر شمعے بدست ساربان ست
سلیمان ست گوئی در عماری | کہ برباد صبا تختش روان ست
ز روی کارِ من برقع برانداخت | بیکبار آنکہ در برقع نہان ست
شتر پیشی گرفت از من برفتار | کہ بر من بیش ازان بارِ گران ست
بدار اے ساربان محمل زمانہ | کہ عہدِ وصل را آخر زمان ست
یار بار افتادہ را در کاروان بگذاشتند | بیوفا یاران کہ بربستند بار خویش را
ہر کرا در خاکِ غربت پاے در گل ماند ماند | گو دگر در خواب خوش بیند دیار خویش را
پیوند روح میکند این باد مشک بیز | ہنگامِ نوبتِ سحر ست ای ندیم خیز
شاہد بخوان و شمع بسوزان و گل بنہ | عنبر بسای و عود بسوزان و گل بریز
خادمۂ سرائے را گو در حجرہ بند کن | تا بہ سرِ حضورِ مارہ نبرد موسوسے

(4) وہ اکثر حالات وواردات کو جو اُس کے دل پر گزرتے ہیں تمثیلات میں بیان کر کے کلام کو نہایت بلیغ اور بلند کر دیتا ہے۔ اِس قسم کی تمثیلات حکیم سنائی اور مولانا روم کے کلام میں بھی بہت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً

گنج شائگان افتادہ بودم	ندانستم کہ در گنج اند ماران
اے برادر ما بگرداب اندریم	وانکہ شفعت میزند بر ساحل ست
رطب شیرین و دست از نخل کوتاہ	زلال اندرمیان و تشنہ محروم
اُستادِ کیمیا را بسیار زر باید	در خاک تیرہ کردن تا آنکہ زر بپاشد

(5) شیخ کی غزل میں باوجود کمال سادگی اور صفائی کے اکثر ایک نزاکت اور چوچلا پایا جاتا ہے جس سے قدما کی غزل معرا معلوم ہوتی ہے وہ ایک سیدھی سی بات کو ہیر پھیر کر ایسے لطیف اور خوشنما پیرایے میں ادا کر دیتا ہے جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ سنگریزوں کو ترتیب دے کر موتیوں کی لڑی سے زیادہ خوشنما اور گران بہا بنا دیتا ہے۔ مثلاً

بود ہمیشہ پیش ازین رسم تو بیکنہ کشی	از چہ مرا نمی کشی من چہ گناہ کردہ ام
خلق را بیدار باید بود زآبِ چشم من	وین عجب کان وقت میگریم کہ کس بیدار نیست
من ندانستم از اوّل کہ تو بے مہر و وفائی	عہد نابستن ازان بہ کہ بہ بندی و نپائی
دوستان عیب کنندم کہ چرا دل بتو دادم	باید اوّل بتو گفتن کہ چنین خوب چرائی
گفتہ بودم چو بیائی غمِ دل با تو بگویم	چہ بگویم کہ غم از دل برود چون تو بیائی
من آن نیم کہ حلال از حرام نشناسم	شراب با تو حلال ست وآب بیتو حرام

اِس خاصیت میں شیخ کی غزل سے جو نسبت قُدما کی غزل کو ہے اُس کا اندازہ شیخ کے چند اشعار کا مقابلہ قُدما کے اشعار کے ساتھ کرنے سے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اِس مقام پر دو شعر خاقانی اور انوری کے اور اُن کے ہم مضمون اشعار شیخ کے دیوان سے نقل کیے جاتے ہیں۔

انوری	سعدی
روی چون ماہِ آسمان داری	سرو را مانی ولیکن سرو را رفتار نیست
قدِ چون سرو بوستان داری	ماہ را مانی ولیکن ماہ را گفتار نیست

ایضاً

ہمہ با من جفا کند لیکن
بجفا ہیچ ازو نیازارم

ایضاً

قادری بر ہرچہ میخواہی بجز آزار من
زانکہ گر شمشیر بر فرقم زنی آزار نیست

خاقانی

بہ رخت چہ چشم دارم کہ نظر دریغ داری
بہ رہت چہ گوش دارم کہ خبر دریغ داری

ایضاً

ہمہ چشمیم تا برون آئی
ہمہ گوشیم تا چہ فرمائی

ایضاً

شاد باش از حسن خود کز وصفِ تو سحر حلال
طبع خاقانی بہ نظم آورد و دیوان تازہ کرد

ایضاً

ہردم از شاخ زبانم میوۂ تر میرسد
بوستانہا رُستہ زان تخمیکہ در دل کاشتی

---

(6) سب سے بڑی بات جو شیخ اور قُدما کی غزل میں مابہ الامتیاز ہے اور جس کے سبب سے اُس کے دیوان کو نمکدانِ شعرا کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شیخ کی غزل کا مدار زیادہ تر مضامین مندرجہ ذیل پر ہے تصوف اور درویشی، عشق حقیقی کو عشق مجازی کے پیرایے میں ادا کرنا اور شاہد مطلق کے شیون اور صفات کو زلف وخال وخط ولب ودندان وغیرہ سے تعبیر کرنا۔ کاملین اور عرفا اور مشائخ پر رند، بادہ خوار میفروش، پیر خرابات وغیرہ کے الفاظ اطلاق کرنے اور اُن کے حالات اور واردات کو شراب ونغمہ ودف وچنگ وغیرہ کے لباس میں ظاہر کرنا۔ سلوک اور فقیری کے مدارج مقامات یعنی صبر ورضا وتسلیم وتوکل وقناعت وغیرہ کو نئے نئے عنوان اور اسلوب سے بیان کرنا۔ محتسب وزاہد وفقیہ اور ایسے لوگوں پر جو مذہب کی رو سے محل ادب ہیں طعن وتعریض کرنی اور غیر متشرّع اور آزاد لوگ جو از روے مذہب قابلِ توہین ومذمت ہیں اُن کی خوبی ظاہر کرنی۔ دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کو طرح طرح سے جتانا۔ ناصحوں کی نصیحت سے نفرت اور رسوائی وبدنامی کی رغبت ظاہر کرنی۔ عقل ودانش کی جابجا توہین اور عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دے کر اُس کی تعریف کرنی۔ ساقی ومطرب کو بار بار پکارنا اور اُن سے شراب ونغمے کا اس لیے طلبگار ہونا کہ دنیا کے تعلقات سے انقطاع میسر آئے۔ بادِ صبا اور نسیم سحری اور بوے گل کو اکثر مخاطب کرنا اور اُن کو قاصد وپیغامبر ٹھہرا کر اپنی آرزوئیں اور مرادیں اور حسرتیں اُن سے بیان کرنی وغیرہ وغیرہ یہ تمام عنوان ہر شخص کو مرغوب ہوتے ہیں

مثلاً عشق حقیقی کی واردات اور کیفیات عشق مجازی کے پیرایے میں بیان کرنی اور زلف و خال و خط سے شاہد مطلق کے شیون اور صفات مراد لینی زیادہ دلکش اور موثر ہیں بہ نسبت اِس کے کہ کھلی سورٹھ گائی جائے۔ یعنی عشق حقیقی کو صاف صاف اس طرح بیان کیا جائے جیسے اکثر ادنیٰ درجے کے شاعر یا موزوں طبع مولوی اور واعظ نظم میں توحید و مناجات وغیرہ لکھا کرتے ہیں۔ حضرت مولانا روم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران گفتہ آید در حدیثِ دیگران

اسی طرح واعظ، زاہد، شیخ، قاضی، صوفی، محتسب اور ایسے اشخاص کو جن کی مذہب میں تعظیم کی جاتی ہے۔ ریا کاری اور مکر اور سالوس وغیرہ کے بہانے سے لتاڑنا اور رند اوباش اور حُسن پرست و بادہ خوار لوگوں کو اُن کی صاف باطنی۔ آزادی اور بے ریائی کی وجہ سے تعریف کرنی بہ نسبت اِس کے کہ رندوں کو ملامت کی جائے اور متشرع لوگوں کی تعریف کی جائے زیادہ مزے دار ہے اور زیادہ توجہ سے سنا جاتا ہے۔

اگرچہ اِن میں سے بعض عنوان جستہ جستہ قدما کی غزل میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن شیخ کے ہاں اول تو کثرت سے ہیں اور دوسرے اُس کے حسن بیان نے اُن کو بہت زیادہ اور لطف انگیز کر دیا ہے۔ شیخ کے بعد اول حضرت امیر خسرو اور میر حسن دہلوی نے اِس خصوصیت میں شیخ کا تتبع کیا ہے کیونکہ شیخ نے اپنے چاروں دیوان جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ملتان میں خان شہید کے پاس جس کے ہاں امیر خسرو نوکر تھے اپنی زندگی ہی میں بھیج دیے تھے۔ اس وقت حضرت امیر کی عمر تیس برس سے بھی کچھ کم تھی اور شاعری میں ترقی کرنے کے لیے اُن کے آگے ایک وسیع میدان موجود تھا۔ وہ اگرچہ اور اصناف سخن میں جیسا کہ مثنوی نہ سپہر [1] میں

1۔ نہ سپہر کے اشعار یہ ہیں۔

کس نہ بیند سوِ نظم دلگیر کہ نگردد بدلے منزل گیر
چون نماند بہ دل خلقے یاد گرچہ شد زادہ ہمان دان کہ نزاد
تا بجائے کہ حد پارسیان اندرین عہد دو تن گشت عیان
زان یکے سعدی و ثانیش ہمام ہر دو را در غزل آئین تمام
لیک اگر سوے دگر بازے ہست شعر شان ہست بدان گونہ کہ ہست

لکھتے ہیں اپنے تئیں شیخ سے بہتر سمجھتے تھے مگر شیخ کی غزل کو وہ بھی مانتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت　　　شیرہ از خم خانۂ مستی کہ در شیراز بود

نیز جس طرح شیخ نے بچپن کے زمانہ کی غزلوں کا نام غزلیاتِ قدیم اور جوانی اور کہولت کی غزلیات کا نام طیّبات اور بدائع اور آخر عمر کی غزلیات کا نام خواتیم رکھا ہے اسی طرح حضرت امیر نے بھی عمر کے چار زمانوں کے موافق چار دیوان مرتب کیے ہیں۔ تحفۃ الصغر۔ وسط الحیاۃ۔ غرۃ الکمال۔ بقیہ نقیہ۔ اِن قرینوں کے سوا حضرت امیر کی غزلیات سے بھی صاف پایا جاتا ہے کہ وہ سعدی کے تتبع سے خالی نہ تھے۔ امیر خسرو کے بعد خواجہ حافظ شیراز نے بھی غزل کی بنیاد زیادہ تر اُنھیں خیالات پر رکھی ہے جن کو سب سے اول شیخ نے چمکایا تھا مگر اُن میں بعض مضامین کو خواجہ حافظ نے ایسی رونق دی ہے کہ وہ اُنھیں کا حصّہ ہو گئے ہیں۔ جیسے تصوف، شراب، اہلِ ظاہر پر خردہ گیری، دنیا کی بے ثباتی، عقل و تدبیر کی توہین، عشق و جوانی کی ترغیب وغیرہ وغیرہ۔

اب ہم کچھ غزلیں اور اشعار شیخ کے دیوان میں سے ایسے نقل کرتے ہیں جن میں مضامین مذکورۂ بالا زیادہ تر باندھے گئے ہیں۔

برخیز تا یکسو نہیم این دلقِ ارزق فام را　　　بر باد قلّاشی دہیم این شرک تقویٰ نام را
مے با جوانان خوردنم خاطر تمنا میکند　　　تا کودکان در پے فتند این پیر دردآشام را
زین تنگنای خلوتم خاطر بہ صحرا مے کشد　　　کز بوستان بادِ سحر خوش میدہد پیغام را
غافل مباش ار عاقلی دریاب گر صاحبدلی　　　باشد کہ نتواں یافتن دیگر چنین ایام را
جائیکہ سرو بوستان با پاے چوبین میرود　　　ما نیز در رقص آوریم آن سرو سیم اندام را

☆☆☆

وقتِ طرب خوش یافتیم آن دلبر طناز را　　　ساقی بیار آن جام مے مطرب بساز آن ساز را
امشب کہ بزم عارفان از شمع رویت روشنست　　　آہستہ تا نبود خبر رندانِ شاہد باز را
روی خوش و آوازِ خوش دارند ہریک لذتے　　　بنگر کہ لذت چون بود محبوبِ خوش آواز را

☆☆☆

جان ندارد ہرکہ جانانیش نیست
تنگ عیش ست آنکہ بستانیش نیست

گر دلے داری بدلدارے سپار
ضایع آن کشور کہ سلطانیش نیست

ماجرائے عقل پرسیدم ز عشق
گفت معزول ست و فرمانیش نیست

دردِ عشق از تندرستی خوشتر ست
گرچہ غیر از صبر درمانیش نیست

☆☆☆

چنان بموی تو آشفتہ ام ببوی مست
کہ نیستم خبر از ہرچہ در دو عالم ہست

دگر بروی کسم دیدہ بر نمے باشد
خلیل من ہمہ بت ہائے آذری بشکست

غلامِ ہمت آنم کہ پائے بند یکیست
بجانبے متعلق شد از ہزار برست

نگاہِ من بتو و دیگران بتو مشغول
معاشران زمے و عارفان زساقی مست

برادران و عزیزان نصیحتم نکنید
کہ اختیار من از دست رفت و تیر از شست

☆☆☆

خوشتر از دوران عشق ایام نیست
بامدادِ عاشقان را شام نیست

مطربان رفتند و صوفی در سماع
عشق را آغاز ہست انجام نیست

از ہزاران در یکے گیرد سماع
زانکہ ہر کس محرمِ پیغام نیست

ہر کسے را نامِ معشوقی کہ ہست
می برد معشوقِ مارا نام نیست

باد صبح و خاکِ شیراز آتشے ست
ہرکہ او دروے گرفت آرام نیست

سعدیا چون بُت شکستی خود مباش
خود پرستی کمتر از اصنام نیست

☆☆☆

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگست
ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگست

برادرانِ طریقت نصیحتم مکنید
کہ توبہ در رہِ عشق آبگینہ و سنگست

وگر بہ خفیہ نمی بایدم شراب و سماع
کہ نیک نامی در دینِ عاشقان ننگست

چہ تربیت شنوم یا چہ مصلحت بینم
مرا کہ چشم بساقی و گوش بر چنگست

بخشم رفتۂ مارا کہ میبرد پیغام
بیا کہ ما سپر انداختیم گر جنگست

بیادگار کسے دامنِ نسیم صباح
گرفتہ ایم و چہ حاصل کہ باد در چنگست

بکش چنانکہ تو دانی کہ بے مشاہدہ است | فراختای جہان بر وجودِ ما تنگست
ملامت از دلِ سعدی فرو نشوید عشق | سیاہی از حبشی چون رود کہ خود رنگست

☆☆☆

دوش بے روی تو آتش بسرم برمیشد | آبم از دیدہ ہمیرفت و زمین تر میشد
تا بہ افسوس بپایان نرود عمرِ عزیز | ہمہ شب ذکر تو میرفت و مکرّر میشد
چشم مجنون چو بخفتے ہمہ لیلیٰ دیدے | مدعی بود گرش خواب میسر میشد
یا رب آن صبح کجا رفت کہ شبہائے دگر | نفسے میزد و آفاق منور میشد
سعدیا عقدِ ثریا مگر امشب بگسیخت | ورنہ ہر شب ز گریبان سحر بر میشد

☆☆☆

متقلب درونِ جامۂ ناز | چہ خبر دارد از شبانِ دراز
جہد کردم کہ دل بکس ندہم | چہ توان کرد با دو دیدۂ باز
محتسب در قفائے رندان ست | غافل از صوفیانِ شاہد باز

☆☆☆

از تو با مصلحتِ خویش نمی پردازم | ہمچو پروانہ کہ مے سوزم و در پروازم
گر تو خواہی کہ بجوئی دلم امروز بجوی | ورنہ بسیار بجوئی و نیابی بازم
من خراباتی و دیوانہ ام و عاشق و بس | بیشتر زین چہ حکایت بکند غمازم
ماجرائے دلِ دیوانہ بگفتم بہ طبیب | کہ ہمہ شب درچشم ست بفکرت بازم
گفت زین نوع شکایت کہ تو داری سعدی | دردِ عشق ست ندانم کہ چہ درمان سازم

☆☆☆

برخیز تا طریق تکلف رہا کنیم | دکانِ معرفت بدو جو بہا کنیم
گر دیگر آن نگار قبا پوش بگورد | ما نیز جامہائے تصوّف قبا کنیم

☆☆☆

ساقیائے دہ کہ ما دردی کشِ میخانہ ایم | با خرابات آشناؤ از خرد بیگانہ ایم
خویشتن سوزیم و جان بر سر نہادہ شمع وار | ہر کجا در مجلسے شمعے ست ما پروانہ ایم

اہل دانش را درین گفتار با ما کار نیست　　عاقلان را کے زیان دارد کہ ما دیوانہ ایم
خلق میگویند جاہ و فضل در فرزانگیست　　گو مباش اینہا کہ ما رندانِ نا فرزانہ ایم
عیبِ تست ار چشم گوہر بین نداری ورنہ　　ہر یک اندر بحرِ معنی گوہر یکدانہ ایم

☆☆☆

دو چشم مست میگونش ببرد آرام ہشیاران　　دو خواب آلودہ بربودند عقل از دستِ بیداران
نصیحت گوی را از من بگوا ے خواجہ دم درکش　　کہ سیل از سر گذشت آنرا کہ میترسانی از باران
چہ بویست آنکہ عقل از من ببرد و صبر و ہشیاری　　ندانم باغِ فردوس ست و یا بازارِ عطاران
تو با این مردم کوتہ نظر در چاہِ کنعانی　　بمصر ما پدید آیند یوسفؑ را خریداران
اے کہ ز دیدہ غائبی در دل ما نشستۂ　　حسنِ تو جلوہ میکند وین ہمہ پردہ بستۂ
خاطرِ عام بردۂ خونِ خواص خوردۂ　　ما ہمہ صید کردۂ خود ز کمند جستۂ

☆☆☆

می برزند ز مشرق شمع فلک زبانہ　　اے ساقیِ صبوحی در دہ مے شبانہ
عقلم بدزد لختے چند اختیار دانش　　ہوشم ببر زمانے تا کے غمِ زمانہ
صوفی چگونہ گردد گرد شراب صافی　　گنجشک را نہ گنجد عنقا در آشیانہ
آن کوزہ بر کفم نہ کاب حیات دارد　　ہم طعمِ نار دارد ہم رنگِ نار دانہ
گرمی بجان دہندت بستان کہ پیش دانا　　ز آبِ حیات خوشتر خاکِ شرابخانہ
ہر روز باد می برد از بوستان گلے　　مجروح میکند دل مسکین بلبلے
روئیست ماہ پیکر و موئیست مشک بوی　　ہر لالۂ کہ میدمد از خاک و سنبلے
بالای خاک ہیچ عمارت نکردہ اند　　کزوے بدیر و زود نباشد تحولے
مکروہ طلعتے ست جہانِ فریب ناک　　بر بامداد کردہ بہ شوخی تجملے
دے بوستان و خرم صحراؤ لالہ زار　　و ز بانگِ مُرغ در چمن اُفتادہ غلغلے
و امروز خارہائے مغیلان کشیدہ تیغ　　گوئی کہ خود نبود درین بوستان گلے
دنیا پلے ست رہگذرِ دارِ آخرت　　اہلِ تمیز خانہ نگیرند بر پُلے

☆☆☆

ایکه آگاه نهٔ عالمِ درویشان را — تو چه دانی که چه سودا به سرست ایشانرا
گنج آزادگی و گنجِ قناعت ملکی ست — که بشمشیر میسر نشود سلطان را
طلب منصبِ فانی نکند صاحب عقل — عاقل آنست که اندیشه کند پایان را
جمع کردند و نهادند و بحسرت رفتند — وین چه دارد که بحسرت نگذارد آن را
در ازل بود که پیمانِ محبت بستند — نشکند مرد اگرش سر برود پیمان را
عاشقے سوختهٔ بے سر و سامان دیدم — گفتم اے یار مکن در سر فکرت جان را
نفسے سرد برآورد و ضعیف از سر زد — گفت بگذار من بے سر و بے سامان را
پند دلبند تو در گوش من آید هیهات — منکه بر درد حریصم چه کنم درمان را
سعدیا عمر عزیزست بغفلت مگذار — وقت فرصت نشود فوت مگر نادان را

☆☆☆

لاابالی چه کند دفتر دانائی را — طاقتِ وعظ نباشد سرِ سودائی را
دیده را فائده آنست که دلبر بیند — ورنه بیند چه بود فائده بینائی را
همه دانند که من سبزهٔ خط دارم دوست — نه چو دیگر حیوان سبزهٔ صحرائی را
سعدیا نوبتی امشب دہلِ صبح نکوفت — یا مگر صبح نباشد شبِ تنہائی را

☆☆☆

شبے و شمعے و گویندهٔ و زیبائے — ندارم از همه عالم جز این تمنائے
فرشته رشک برد بر جمالِ مجلسِ من — گر التفات کند چون تو مجلس آرائے
ضرورتست بلا دیدن و جفا بردن — ز دستِ آنکه ندارد بحسن همتائے
قیامت ست که در روزگار ما برخاست — به راستی که بلائیست آن نه بالائے
دگر چه بینی اگر رو ازو بگردانی — که نیست خوشتر ازو در جهان تماشائے
وگر کنی نظر از دور کن که نزدیکست — که سر ببازی اگر پیشتر نہی پائے

☆☆☆

عالم که عارفان را گوید نظر بد و زند — گر یار ما به بیند صاحب نظر باشد
زیرا که بادشاہے چون بقعهٔ بگیرد — بنیاد حکمِ اوّل زیر و زبر باشد

دیوانہ را کہ گوئی ہشیار باش و عاقل ترسم کہ از نصیحت دیوانہ تر بباشد
ساقی بیار جامے مطرب بگوی چیزی لب بر دہانِ نے نہ تا نیشکر بباشد

☆☆☆

بویِ زلف تو باباو عیش ہا دارم اگرچہ عیب کنندم کہ باد پیمائیست
ترا ملامتِ سعدی حلال کے باشد کہ بر کناری و او درمیان دریائیست

الغرض شیخ سے پہلے تغزل کا میلان زیادہ تر عشق مجازی کی طرف تھا اور عشق مجازی کے متعلق بھی صرف وہ بیرونی اور ظاہری حالتیں بیان کی جاتی تھیں جو عام عشق بازوں کی زبان پر جاری ہوتی ہیں۔ شیخ نے اپنی غزل میں ایسی باتیں کم لکھی ہیں بلکہ وہ اکثر عشق و محبت کے پوشیدہ اسرار و غوامض اور عمیق کیفیات اور اندرونی حالات بیان کرتا ہے جو دلبستگی کے زمانہ میں ہر انسان پر گزرتے ہیں لیکن ہر شخص اِن کو بیان نہیں کر سکتا بلکہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ مجھ پر کیا گزر رہا ہے۔ مثلاً یہ بات عشق بازوں اور بوالہوسوں کے زبان زد ہوتی ہے کہ معشوق کی جدائی ایسی سخت چیز ہے جو کسی طرح اور کسی حالت میں برداشت نہیں کی جا سکتی لیکن یہ بات عام نظروں سے مخفی ہوتی ہے کہ وصل کی امید پر جدائی بسر کرنی ایسی مشکل نہیں ہے جیسی خیال کی جاتی ہے جیسا کہ شیخ کہتا ہے۔

اے کہ گفتی ہیچ مشکل چون فراق یار نیست گر امید وصل باشد آنچنان دشوار نیست

یا مثلاً جو لوگ کسی کے عشق میں مبتلا ہیں اور باوجود کمال اشتیاق کے وصل سے بہرہ مند نہیں ہوتے وہ عموماً عشق و محبت کی قید سے آزاد ہونے کی آرزوئیں کیا کرتے ہیں اور اُس موقع کو یاد کر کے پچھتاتے ہیں جب کہ دلبستگی کے سامان اُنھوں نے خود مہیا کیے تھے اور بار بار صورت دیکھنے یا باتیں سننے یا ربط بڑھانے سے ایک مردہ چنگاری کو زیادہ افروختہ کیا تھا لیکن اُن کو یہ شعور بہت کم ہوتا ہے کہ اِس جلن اور سوزش میں کس قدر لذّت چھپی ہوئی ہے اور یہ کہ اگر بالفرض ترک عشق و محبت پر اُن کو اختیار دے دیا جائے تو وہ ہرگز اس دلبند قید سے چھوٹنا گوارا نہیں کر سکتے جیسا کہ شیخ نے کہا۔

بر عندلیب عاشق گر بشکنی قفس را از ذوقِ اندرونش پروائے در نباشد

یا مثلاً عشاق کا عام خیال یہ ہے کہ معشوق کے دیکھنے سے کبھی جی سیر نہیں ہوتا اور جب

تک وہ سامنے رہتا ہے عاشق اُس کے دیکھنے سے باز نہیں رہ سکتا مگر یہ بات بہت کم خیال میں گزرتی ہے کہ عُشاق کو بسا اوقات ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں کہ باوجود کمال اشتیاق کے معشوق کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے جیسا کہ شیخ کہتا ہے۔

دل و جانم بتو مشغول ونگہ برچپ وراست　　　تا ندانند رقیبان کہ تو منظور منی

یا مثلاً عشاق کا عام خیال یہ ہے کہ دوست سے جب مدت کے بعد ملاقات ہوتی ہے تو وہ شکوہ شکایت اور جدائی کی مصیبتیں بیان کرنے کا موقع ہوتا ہے مگر اس واقعی کیفیت سے بے خبر ہوتے ہیں کہ جب دوست سے ملاقات ہوتی ہے تو اُس کے ملنے کی خوشی میں اکثر تمام شکوے اور جدائی کے صدمے یک قلم فراموش ہو جاتے ہیں چنانچہ شیخ نے اِس مضمون کو یوں بیان کیا ہے۔

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم　　　چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

غرض کہ ایسے گہرے خیالات سے قدما کی غزل بالکل معرا تھی۔ اوّل شیخ ہی نے اِن مضامین کی بنیاد ڈالی ہے۔ تصوّف و درویشی وغیرہ کے مضامین نے غزل میں اور بھی زیادہ لذت اور نمک اور درد بھر دیا۔ جن اصول پر شیخ نے غزل کی بنیاد رکھی تھی اُس کے بعد اکثر متغزلین نے وہی اصول اختیار کیے کیونکہ اُن کے بغیر غزل کا سرسبز ہونا نہایت دشوار تھا اور اِس طرح رفتہ رفتہ تمام ایران اور ترکستان اور ہندستان میں ایک آگ لگ گئی۔ ہر موزوں طبع نے غزل کہنی اختیار کی اور غزل گویوں کی تعداد حساب اور شمار سے زیادہ بڑھ گئی۔ ازاں جملہ بعض اکابر کی غزل نے شیخ سے بھی زیادہ شہرت اور رواج پایا۔ علی الخصوص خواجہ حافظ شیرازی کی غزل نے اپنا وہ سکہ جمایا کہ مذکورہ بالا ملکوں میں جو لوگ شعر کا مذاق رکھتے تھے یا فقر و درویشی کی چاشنی سے باخبر تھے یا راگ راگنی سے آشنا تھے یا شراب و کباب کا چسکا رکھتے تھے یا عاشق مزاج اور عیش دوست تھے سب جاں و دل سے اُس پر قربان ہو گئے۔ رقص و سرود کی محفلوں میں، حال و قال کی مجلسوں میں، قہوہ خانوں اور شراب خانوں میں، شعرا کی صحبتوں میں مشائخ کے حلقوں میں در و دیوار سے لسان الغیب ہی کی آواز آنے لگی۔

اِس مین کچھ شک نہیں کہ شیخ کی غزل نے فارسی شاعری میں ایک خاص قسم کی وسعت پیدا کی جس کے سبب سے قدرتی جذبات کا ایک طویل الذیل باب یعنی عشق و محبت کے

مضامین نہایت آب ورنگ کے ساتھ بیان کیے گئے۔ مگر اس میں بھی کچھ شبہ نہیں کہ اِس بادۂ ہوش رُبا یعنی غزل سے سوسائٹی کے اخلاق، خیالات اور معاشرت پر کچھ اچھے ثمرے مرتب نہ ہوئے شعر کو خواہ وہ عاشقانہ ہو اور خواہ اخلاقی ایک پوشیدہ تعلق اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے اور جو اشعار کسی قوم میں زیادہ شایع ہو جاتے ہیں اور مجالس و محافل میں ہمیشہ پڑھے اور گائے جاتے ہیں وہ اندر ہی اندر تمام جماعت پر اپنا اثر اِس طرح کرتے ہیں کہ جماعت کو اصلاً شعور نہیں ہوتا اور جس قدر شعر میں نمک اور حسن زیادہ ہوتا ہے اُسی قدر اُس کی تاثیر جلد اور پایدار ہوتی ہے۔ شیخ سعدی، خواجہ حافظ، امیر خسرو، میر حسن سنجری، مولانا جامی وغیرہم کی غزلیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ممالک اسلامیہ کے ایک بڑے حصہ میں عموماً پڑھی اور گائی جاتی ہیں۔

اگر چہ اِن بزرگواروں کا کلام زیادہ تر حقائق اور معارف اور سلوک اور تصوف پر مبنی ہے۔ لیکن اُس میں مجاز وحقیقت کے دونوں پہلو موجود ہیں۔ جس طرح اُس سے ایک صوفی خدا پرست روحانی کیفیت اُٹھاتا ہے اُسی طرح ایک بوالہوس صورت پرست کے نفسانی جذبات اُس کے سننے اور پڑھنے سے برانگیختہ ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ خواجہ حافظ کی غزل مجالس ومحافل میں گائی جاتی ہے اور اُس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں۔ وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے۔ عشق حقیقی کے ساتھ ہی عشق مجازی اور صورت پرستی وکام جوئی کو بھی وہ دین ودنیا کی نعمتوں اور فضیلتوں سے افضل بتاتی ہے مال ودولت، علم و ہنر، نماز روزہ، حج زکوٰۃ، زہد وتقویٰ غرضِ کہ کسی شے کو نظر بازی وشاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی۔ وہ عقل وتدبیر، مآل اندیشی، تمکین ووقار، ننگ وناموس، جاہ ومنصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے۔ اور آوارگی، رسوائی، بدنامی، بدمستی بے سروسامانی وغیرہ کو جو کہ عشق کی بدولت حاصل ہو تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے۔ دولتِ دنیا پر لات مارنا، عقل وتدبیر سے کبھی کام نہ لینا، توکل وقناعت کے نشے میں اپنی ہستی کو مٹانا اور جوہر انسانیت کو خاک میں ملا دینا۔ دنیا وما فیہا کے زوال وفنا کا ہر وقت تصور باندھے رکھنا علم وحکمت کو لغو و پوچ اور حجابِ اکبر جاننا۔ حقائق اشیاء میں کبھی غور وفکر نہ کرنا۔ کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا۔ جو کچھ ہاتھ لگے اُس کو فوراً رائگاں کھو دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں اُس سے مستفاد ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بے فکروں اور نوجوانوں کو بالطبع

مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مطرب و رقاصہ کی خوش آوازی اور حسن و جمال اور مزامیر کی لے اُن کو لے اُڑتی ہے اور اُن کی تاثیر کو دس بیس گنا کر دیتی ہے اور جب باوجود اِن سب باتوں کے سامعین کو یہ بھی اعتقاد ہوتا ہے کہ اس کلام کے قائل اکابر صوفیہ اور مشائخ کرام ہیں جن کی تمام عمر حقائق اور معارف کے بیان کرنے میں گزری ہے اور جس کا شعر شریعت کا لُبِ لُباب اور طریقت کا رہنما اور عالم لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور بھی دلنشیں زیادہ ہوتے ہیں۔ پس ممکن نہیں کہ شیخ اور اُس کے متبعین کی غزل نے سوسائٹی کو اپنے جادو سے اچھوتا چھوڑا ہو۔ اور جب ہم مسلمانوں کے اخلاق اور معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن کو اکثر اُن صفات سے موصوف پاتے ہیں جن کی اِس مجموعۂ غزلیات سے ترغیب ہوتی ہے۔ عشق بازی، حُسن پرستی اُن کے ساتھ اس قدر مخصوص ہے کہ نہ صرف دولت مند بلکہ اکثر فاقہ مست بھی اِس کا چسکا رکھتے ہیں۔ اور نہ صرف نوجوان بلکہ معمر لوگ بھی اُس کا دم بھرتے ہیں۔ فضول خرچی، ناعاقبت اندیشی، عقل و تدبیر سے کچھ کام نہ لینا۔ توکل اور قناعت کے دھوکے میں معاش کی کچھ فکر نہ کرنی۔ غیر قوموں کی ترقی کا ذکر سن کر دنیا و مافیہا کو ہیچ و پوچ بتانا۔ عقل انسانی کو حقائق اشیا کے ادراک سے عاجز جاننا اور موجودہ علمی ترقیات کو سراسر ایک دھوکا سمجھنا وغیرہ وغیرہ ہماری قوم کی عام خاصیتیں ہیں جو ہمارے ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں میں کم و بیش پائی جاتی ہیں۔ اگر چہ یہ بات کہنی مشکل ہے کہ ہم لوگوں میں یہ خاصیتیں اسی شعر و غزل کی بدولت پیدا ہوئی ہیں۔ شاید اس کے اصلی اسباب کچھ اور ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ عاشقانہ اور متصوفانہ اشعار نے اِس حالت کی ترقی دینے میں بہت کچھ مدد پہنچائی ہے۔

سٹیون صاحب نے جو کلکتہ رویو مورخہ جون 1756ء میں خواجہ حافظ کا حال لکھا ہے اُس میں ایک عجیب حکایت لکھی ہے جس کا نقل کرنا اِس مقام پر شاید بے موقع نہ ہوگا وہ لکھتے ہیں کہ سعدی جو کہ حافظ کا چچا ہے ایک روز وہ اور حافظ کسی جگہ بیٹھے تھے اور سعدی غزل لکھ رہا تھا جس کا پہلا مصرعہ حافظ کی بھی نظر پڑ گیا۔ اتفاقاً اُسی وقت سعدی کسی کام کے لیے وہاں سے اُٹھ گیا اور اپنی غزل کا کاغذ ساتھ لے گیا۔ حافظ نے اُس مصرعہ پر دوسرا مصرعہ لگا کر اور پوری بیت ایک پرچے پر لکھ کر وہاں چھوڑ دی۔ اور آپ چل دیا۔ شیخ نے پھر وہاں آ کر حافظ کو نہ پایا

مگر وہ شعر لکھا ہوا دیکھا جس میں سعدی پر کچھ چوٹ کی تھی۔ سعدی اس بات سے ناخوش ہوا اور حافظ کو بلا کر پوچھا کہ یہ شعر تو نے لکھا ہے؟ اُس نے کہا ہاں! شیخ نے اُس سے ساری غزل پوری کرائی اور جب وہ غزل سُنی تو اُس کو بددعا دی کہ ''جو شخص تیری غزل پڑھے گا وہ عقل سے بیگانہ رہے گا'' اس کے بعد صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے اکثر شیعی مسلمان اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ بیشک سعدی کی بددعا حافظ کے حق میں مستجاب ہوئی۔ کیونکہ اُس کے ہر ایک شعر میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''حکایت صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حافظ کی غزل سے دیوانگی اور وحشت پیدا ہوتی ہے۔'' میں کہتا ہوں کہ یہ خیال تو شاید غلط نہ ہو مگر یہ حکایت قطعی غلط ہے کیونکہ شیخ اور خواجہ کی وفات میں پورا ایک صدی کا آگا پیچھا ہے قسطنطنیہ کے شیعوں کا خیال میرے نزدیک اِس اعتبار سے صحیح ہے کہ خواجہ حافظ کی غزل کی ممارست اور مزاولت سے بیشک ابرار واحرار کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور توکل واستغنا وقناعت کا نہایت پختہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور اوباش والواط کو بے فکری، ناعاقبت اندیشی، عشق بازی، بدنامی ورسوائی کی ترغیب ہوتی ہے اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر ہی ویسی ہی خانہ برانداز اور خانماں سوز ہے جیسی دوسری۔ ہر زمانہ کا جدا جدا اقتضا ہوتا ہے۔ جب دولت مند اور ذی اقتدار لوگ دنیا طلبی اور حب جاہ میں سراسر منہمک اور مستغرق ہوجاتے ہیں اور جسمانی خوشیوں میں محو ہوکر روحانی مسرّتوں کو بالکل فراموش کردیتے ہیں اور عقل وشریعت کے احکام معطل ہونے کے قریب جا پہنچتے ہیں اُس وقت البتہ یہ امید ہوسکتی ہے کہ ایسی ترغیبوں سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ لیکن ایسی حالت میں جب کہ تمام قوم کم ہمت اور پست حوصلہ ہوگئی ہو اور اولوالعزمی کا تخم اُن کی طبیعت میں جل گیا ہو۔ اور جب کہ تمام دنیا کی قومیں ترقی کی طرف متوجہ ہوں اُس وقت دنیا سے اُن کا دل سرد کرنا اور قناعت اور توکل کا اُن کو سبق پڑھانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ٹمٹماتے ہوئے چراغ میں بجائے تیل ڈالنے کے زور سے پھونک مار کر اُس کو گل کردینا۔ پس ممکن ہے کہ شیخ اور اُس کے متبعین کی غزل نے اُس زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کے دماغ میں نشۂ جاہ دنیوی عروج پر تھا کچھ مفید نتائج پیدا کیے ہوں لیکن اِس زمانہ میں میرے نزدیک اس سے ضرر کا اندیشہ ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شیخ اور حافظ کی غزل پر کچھ اعتراض کرنا مقصود ہے بلکہ اس سے اُن کی کمال سحر بیانی اور سیف زبانی ثابت ہوتی ہے۔شاعر کا کمال یہی ہے کہ جو کچھ کہے لوگ اُس سے متاثر ہوں نہ یہ کہ اُس سے کبھی مضر نتائج پیدا نہ ہونے پائیں۔ باروت نے باوجودیکہ بنی آدم کی ہزاروں جانیں تلف کی ہیں اور شراب نے بے شمار آدمیوں کو اخلاقی اور جسمانی مضرتیں پہنچائی ہیں باایں ہمہ اِن کے موجدوں کی دانشمندی کا تمام دنیا اعتراف کرتی ہے اور کرے گی۔

قصائد وغیرہ

اِس مجموعے میں شیخ کے مدحیہ قصیدے، مرثیے، ترجیع بند ملمع اور مثلث جمع کیے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ غزلیات کی نسبت بہت تھوڑا ہے۔ شیخ نے قصیدے میں کچھ زیادہ نام اور شہرت حاصل نہیں کی۔ یا تو اُس کی طبیعت ہی کو قصیدہ گوئی اور مدح سرائی کی گون نہ تھی۔ اور یا اُس نے مدح وستایش کے طریقہ مروجہ کو مکروہ سمجھ کر اختیار نہیں کیا مگر چونکہ اُس زمانے کے دستور کے موافق ایک ایسے نامور شاعر کو جیسا کہ شیخ تھا کچھ کچھ قصیدے کے نام سے لکھنا ضرور تھا اِس لیے اُس نے کسی قدر قصائد لکھے ہیں جو کہ پہلے قصیدہ گویوں کی طرز سے بالکل مغائر ہیں۔

شیخ سے پہلے جو حالت قصیدہ گوئی اور مداحی کی مسلمانوں میں تھی اُس کی تفصیل کرنے کا یہاں محل نہیں مگر مختصر یہ ہے کہ منصور بن مہدی عباسی خلیفہ بغداد کے زمانے سے شعرا کو نہایت گراں بہا صلے اور انعام ملنے لگے تھے۔ ایک ایک شعر پر لاکھ لاکھ درہم شاعروں کو مل جاتے تھے خلفا اور امرا کو اپنی تعریفیں سننے کا ایسا شوق ہوگیا تھا کہ اُن کا مداح کسی اور شخص کی مدح میں زیادہ مبالغہ کرتا تھا تو اُن کو سخت ناگوار ہوتا تھا اور اگر تشبیب میں زیادہ شعر لکھ لاتا تو شکایت کرتے تھے کہ یہ لوگ طبیعت کا سارا زور تو خال وخط کی تعریف میں خرچ کردیتے ہیں صرف کچھ بچے کھچے خیالات ہمارے سر مارتے ہیں۔ ہزاروں علما وفضلا نے قصیدہ گوئی اور مداحی کو اپنا پیشہ ٹھیرا لیا تھا اور شاعری میں شہرت ہوجانے کے بعد کسی کو اس بات سے چارہ نہ تھا کہ ذی اقتدار لوگوں کی مدح سرائی میں خامہ فرسائی کرے۔ شعرا تمام ممالک اسلامیہ میں اس امید پر سفر کرتے تھے اور قصیدہ گوئی کی بدولت اطراف وجوانب سے مال ودولت جمع کر کے لاتے تھے۔

عباسیوں کے علاوہ فاطمی، دیلمی، کروی، طاہری، صفاری، سامانی، غزنوی، سلجوقی، خوارزم شاہی وغیرہ تمام سلسلوں میں مداحوں کی نہایت قدر کی جاتی تھی۔ ایران میں بھی

سامانیوں کے عہد سے پہلے تو عربی قصائد ہی کا زور وشور رہا مگر سامانیوں کے زمانے میں ایران کی شاعری کا مدار زیادہ تر فارسی زبان پر آٹھیرا۔ فارسی قصیدے نے بھی خوب رواج پایا۔ ظہیر، رشید، خاقانی اور انوری وغیرہم نے فارسی قصیدے میں وہی شہرت حاصل کی جو عربی میں متنبی، ابوتمام، بحتری اور ذوالرمۃ نے حاصل کی تھی۔

اِس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ سعدی جیسے مشہور شاعر کو سلاطین و امراے عہد کی تعریف میں قصیدہ لکھنا ایسا ہی ضروری تھا جیسے درباریوں کو جشن اور تہواروں میں نذر دکھانا مگر قصیدے کی حالت اُس وقت ایسی بُری تھی کی شیخ کو اپنی جبلّی استقامت اور سنجیدگی کے سبب اُس روش پر چلنا دشوار تھا۔ ممدوح کی ستایش میں سراسر عقل و عادت کے خلاف مبالغے کیے جاتے تھے۔ الفاظ کی سادگی اور بے تکلفی قصائد میں مذموم سمجھی جاتی تھی۔ مسائل علمیہ اور مقدماتِ حکمیہ اور سلوک و تصوف کے دقائق اور علوم مختلفہ کی اصطلاحیں اظہار علم و فضل کے لیے اُن میں بالقصد داخل کی جاتی تھیں۔ صنایع لفظی خصوصاً تجنیس و ترصیع وغیرہ کو اُن کا زیور سمجھتے تھے۔ شیخ کی آزادی اور حق گوئی خصوصاً سادہ بیانی جو اُس کی طبیعت میں ودیعت کی گئی تھی اِن تکلفاتِ لایعنی سے مانع تھی اُس کے کلام سے جا بجا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ مبالغہ اور خوشامد کو نہایت ناپسند کرتا تھا۔ ظہیر فاریابی نے قزل ارسلان کی مدح میں ایک جگہ یہ شعر لکھا ہے۔

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیرِ پائے   تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلان دہد

شیخ بوستان میں جہاں اتابک ابوبکر سعد کی تعریف لکھتا ہے وہاں ظہیر کے اس شعر پر اس طرح تعریض کرتا ہے۔

براہ تکلف مرو سعدیا   اگر صدق داری بیار و بیا
تو منزل شناسی و شہ راہ رو   تو حق گو و خسرو حقائق شنو
چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان   نہی زیرِ پائے قزل ارسلان
مگو پائے عزّت بر افلاک نہ   بگو روئے اخلاص بر خاک نہ

اِس کے سوا اور اکثر جگہ اُس نے مدّاح پیشگی سے نفرت اور اعراض ظاہر کیا ہے۔ اُس کے ایک قطعہ کا یہ مضمون ہے کہ ''لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ اے سعدی تو کیوں سختیاں اُٹھاتا

ہے اور کیوں اپنے کمال شاعری سے متمتع نہیں ہوتا؟ اگر تو مدح گوئی اختیار کرے تو نہال ہوجائے۔ مگر مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی رئیس یا امیر کے دروازے پر اپنا مطلب دریوزہ گروں کی طرح لے جاؤں۔ اگر ایک جوہر ہنر کے عوض میں کوئی مجھ کو سوخزانے بخش دے تو وہ مستحق شکر ہے اور میں قابلِ نفریں۔''

شیخ کو قطع نظر اس کے کہ مبالغہ اور خوشامد سے نفرت تھی کوئی ضرورت بھی ایسی داعی نہ تھی کہ وہ آنکھیں بند کر کے اگلی بھیڑوں کے پیچھے قدم بقدم چلنے پر مجبور ہوجاتا اور قصیدہ گوئی کا جو اُس وقت کمال سمجھا جاتا تھا اُس کے حاصل کرنے میں مقتضائے طبیعت کے خلاف کوشش کرتا۔ وہ سلطانی خدمات سے ہمیشہ متنفر رہتا تھا اور اپنے دوستوں کو اِس سے باز رکھنے میں کوشش کرتا تھا۔ پس اُس کو اِس بات کی کچھ پروانہ تھی کہ قصیدہ کو مقبول خاص و عام بنائے اور اِس ذریعہ سے دربار میں تقرب حاصل کرے جتنے نامی قصیدہ گو ایران میں گزرے ہیں سب بادشاہوں کے ہاں اس خدمت پر مامور رہے ہیں کہ خوشی کی تقریبوں میں طوفان کے تودے بنا کر لائیں اور اُن میں جس قدر زیادہ مبالغہ اور جھوٹ کو کام فرمائیں اُسی قدر گراں بہا صلے اور انعام پائیں۔ چنانچہ ظہیر قزل ارسلان کے ہاں، انوری سلطان سنجری کے ہاں، رشید وطواط خوارزم شاہ اُتسز کے ہاں اور خاقانی شروان شاہ کے ہاں ملک الشعرا تھے۔ اِن لوگوں کی تمام طاقت اور لیاقت قصیدہ گوئی میں صرف ہوتی تھی اور اُن کی ترقی اور تقرب کا مدار صرف اُن باتوں پر تھا جو اُس زمانے میں قصیدہ گوئی کے لیے ضروری تھیں یہی سبب ہے کہ قصیدہ کے سوا کوئی بڑی یادگار اُنھوں نے نہیں چھوڑی۔

پس اگرچہ شیخ جیسے مشہور اور نامور شاعر کو اُس زمانے کے دستور کے موافق کچھ نہ کچھ قصیدہ کے نام سے لکھنا ضرور تھا۔ لیکن اُس کو ویسے جھوٹے اور نمایشی طلسم باندھنے کچھ ضرور نہ تھے جیسے کہ انوری اور ظہیر وغیرہ نے باندھے ہیں۔ اِسی لیے غلطی سے یہ خیال کیا گیا ہے کہ شیخ کو قصیدہ لکھنا نہ آتا تھا۔ میں ہرگز اِس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ اُس کو معمولی چمک دمک کے ساتھ قصیدہ لکھنے پر قدرت نہ تھی بلکہ میرے نزدیک جس طرح رولر ٹیڑھا خط کھینچنے سے مانع ہوتا ہے اُسی طرح طبیعت کی استقامت کبھی بے راہ نہیں چلنے دیتی۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی میں جس قدر قصیدہ حد شاعری سے متجاوز ہوگیا ہے ایسی اور کوئی صنعت نہیں ہوئی۔ مدحیہ قصائد

سے ہمیشہ یہ مقصود ہونا چاہیے کہ ممدوح کی صفات کو سن کر خاص و عام کے دل میں اُس کی محبت اور اُس کے ساتھ حُسنِ ظن پیدا ہو اور خود ممدوح پر یہ اثر ہونا چاہیے کہ اگر وہ صفتیں اُس میں موجود ہوں تو اُن میں اور زیادہ ترقی کرے یا کم سے کم اُن کو اُسی حال پر قایم رکھے اور اگر نہ ہوں تو اُن کے حاصل کرنے میں کوشش کرے یہ مطلب جیسا کہ ظاہر ہے جب ہی حاصل ہوسکتا ہے کہ جو صفات کہ مدح میں ذکر کی جائیں وہ ممدوح کی ذات میں یا تو فی الواقع موجود ہوں یا اُن کے موجود ہونے کا احتمال ہو۔ ورنہ ممدوح کے دل میں اُس مدح کی وقعت ایک ہجو ملیح سے زیادہ نہ ہوگی۔ مثلاً ظہیر فاریابی نے جو قزل ارسلان کی مدح میں یہ لکھا ہے کہ ''تصور جب ساتوں آسمانوں اور عرش و کرسی کو طے کر لیتا ہے تب جا کر قزل ارسلان کی رکاب پر بوسا دیتا ہے۔ اِس سے قزل ارسلان کے دل پر سوا اِس کے کہ اُس کو ایک ہجو ملیح سمجھا ہو اور کیا اثر ہوا ہوگا۔ یا مثلاً انوری جو مجد الدین ابوالحسن کی شان میں لکھتا ہے کہ ''اگر وہ زمانہ گزشتہ کو رجعت کا حکم دے تو پھر کر زمانہ آیندہ کی جگہ آجائے'' اِس سے ابوالحسن کے دل میں سوا اس کے کہ مدّاح مجھ کو بناتا ہے یا میرا خاکا اُڑاتا ہے اور کیا خیال گزرا ہوگا۔ یہی حال اُن تمام قصیدہ گویوں کی مدح کا ہے جن کو ایران اور ہندستان وغیرہ میں سب نے تسلیم کیا ہے۔
شیخ نے نہ عدم قدرت کے سبب بلکہ فرط کراہت کے سبب مدح وستایش کے اِس ناپسندیدہ طریقہ کو اختیار نہیں کیا۔ اُس نے قصائد بھی اُسی اپنی شیریں زبانی اور سادہ بیانی و بے تکلفی کے ساتھ جو کہ اُس کے کلام کی عام خاصیت ہے لکھے ہیں۔ اُس کے قصائد سے کمال آزادی اور حق گوئی ثابت ہوتی ہے۔ اُس نے اکثر قصیدے اور ترجیع بند وغیرہ محض محبت اور خلوص اور دلی جوش سے لکھے ہیں۔ نہ خوشامد کی راہ سے اور نہ صلہ و انعام کی اُمید پر۔ باقی جس قدر قصیدے بضرورت سلاطین عہد اور حکام وقت کی شان میں لکھے ہیں اُن کے اسلوبِ بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اُس نے اہل دنیا کی تنبیہ اور نصیحت و پند کے لیے قصیدہ کو اُن سے خطاب کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیا تھا۔ کیونکہ وہ بالکل مواعظ و نصائح سے بھرے ہوئے ہیں۔ بعض قصیدوں میں پند و اندرز کے سوا مدحیہ اشعار دو چار سے زیادہ نہیں۔ یہ وہ قصیدے ہیں جو اُس نے اپنے دوست اور معتقد امیروں اور بادشاہوں کے ساتھ نامزد کیے ہیں۔ اِن کے سوا اور قصیدوں میں اول مدح وستایش کی چاٹ دے کر پھر نصیحت کرنی شروع کی ہے۔

شیخ کی قصیدہ گوئی کا ڈھنگ اور اُس کی علّت غائی جو اُس نے قرار دی تھی ذیل کے اشعار سے معلوم ہو سکتی ہے۔

اتابک ابوبکر بن سعد زنگی جو فارس کا بادشاہ تھا اور شیخ اُس کی رعایا میں سے تھا اُس کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے۔

بنوبت اند ملوک اندرین سپنج سرائے — کنون کہ نوبت تست اے ملک بعدل گرائے
چہ مایہ بر سر این ملک سروران بودند — چو دور عمر بسر شد در آمدند از پائے
نیاز باید و طاعت نہ شوکت و ناموس — بلند بانگ چہ سود و میان تہی چو درائے
بہ تیغ و نیزہ گرفتند جنگجویان ملک — تو برّ و بحر گرفتی بعدل و ہمّت و رائے
چو ہمّت است چہ حاجت بہ گرز مغفر کوب — چو دولت است چہ حاجت بہ تیر جوش خائے
عمل بیار کہ رختِ سرائے آخرت است — نہ عود سوز بکار آیدت نہ عنبر سائے
ہر آنکست کہ بہ آزار خلق فرماید — عدوے مملکت است آن بکشتنش فرمائے
بکامۂ دلِ دشمن نشیند آن مغرور — کہ بشنود سخن دشمنان و دوست نمائے
دیار مشرق و مغرب بگیر و جنگ مجوے — دلے بدست کن و زنگ خاطرے بزدائے
نگویمت چو زبان آورانِ رنگ آمیز — کہ ابر مشک فشانی و بحر گوہر زائے
نکاہد انچہ نوشتہ است عمر و نفزاید — پس اینچہ فائدہ گفتن کہ تا بحشر بپائے

دوسرے قصیدہ میں چند مدحیہ شعر لکھ کر اتابک ابوبکر کی طرف اس طرح خطاب کرتا ہے۔

مدیح شیوۂ درویش نیست تا گویم — کہ ہمچو بحر محیطی و ابر آذاری
نگویمت کہ بفضل از کرام ممتازی — نگویمت کہ بعدل از ملوک مختاری
وگرچہ این ہمہ ہستی نصیحت اولیٰ تر — کہ پند راہ خلاص است و دوستی یاری
بسعی کوش کہ ناگہ فراغتت نبود — کہ سر بخاری، اگر روے شیر نرخاری
خدائے یوسف صدیق را عزیز نہ کرد — بخوبروی ۔ و لیکن بخوب کرداری
شکوہ لشکر و جاہ و جلال و مالت ہست — دلے بکار نیاید بجز نکو کاری
بقائے مملکت اندر وجود یک حرفست — کہ دست ہیچ قوی بر ضعیف نگماری

پس از گرفتنِ عالم چو کوچ خواہد بُود — رواست گر ہمہ عالم گرفتہ انگاری
بہ نیک و بد چو باید گزشت آن بہتر — کہ نیک نام بدست آوری و بگزاری
ہزار سال نگویم بقائے عمر تو باد — کہ این مبالغہ دانم ز عقل نشماری
ہمین سعادت و توفیق بر مزیدت باد — کہ حق گزاری و نا حق کسے نیازاری

اتا بک سلجوق شاہ بن سلغر شاہ جو اتا بکوں کے خاندان میں بڑا ظالم بادشاہ گزرا ہے اور جو آخر کو اپنے ظلم کے سبب قتل کیا گیا اُس کی مدح میں چند شعر لکھ کر کہتا ہے۔

مرادِ سعدی از انشاد و زحمتِ خدمت — نصیحت است بسمع قبول شاہنشاہ
دوامِ دولت و آرامِ مملکت خواہی — ثبات راحت و امنِ مزید و رفعت و جاہ
کمر بطاعت و انصاف و عدل وعفو بہ بند — چو دست رحمتِ حق بر سرت نہادہ کلاہ
تو روشن آئینہ ز آہِ دردمند بہ ترس — عزیز من! کہ اثر میکند در آئینہ آہ
معلّمان بد آموز را سخن مشنو — کہ دیر سال بمانی بکام نیکی خواہ

ایل خان یعنی ہلاکو خان یا اُس کے بیٹے ابا قاخان کی شان میں جن کی ہیبت سے روم و روس وچین کے بادشاہ لرزتے تھے مدحیہ اشعار کہہ کر لکھتا ہے۔

ہر نوبتے نظر بہ یکے مے کند سپہر — ہر مدتے زمین بہ یکے میدہد امان
بیجے نشان کہ دولت باقیت بر دہد — کاین باغِ عمر گاہ بہارست و گہ خزان
اے بادشاہ روئے زمین دور از آن تست — اندیشۂ تقلب دوران کن و زمان
چون کام جاودان متصوّر نمے شود — خرّم کسیکہ زندہ کند نامِ جاودان
نادان کہ بخل مے کند و گنج مے نہد — مزدور دشمن ست تو بر دوستان فشان
یا رب تو ہرچہ رائے صوابست وفعل خیر — اندر دل وے افگن و بر دست وے برآن
آہوئے طبع بندہ چنیں مشک میدہد — کز پارس میبرند بہ تاتارش ارمغان

سردار انکیانو جو خاندان اتا بک کے زوال کے بعد سلطان ابا قاخان پسر ہلاکو خان کے حکم سے فارس کا فرمان روا مقرر ہوا تھا اور اپنے قدیم تا تاری مذہب پر نہایت پختگی سے

ثابت قدم تھا اُس کے شان میں جتنے قصیدے شیخ نے لکھے ہیں اُن میں متعدد اشعار کے سوا باقی تمام نصیحت و پند مندرج ہے ازانجملہ ایک قصیدہ میں بہت سے مواعظ و نصائح کے بعد لکھا ہے۔

حرامش باد ملک و بادشاہی | کہ پیشش مدح گویند از قفا ذم
عروسِ زشت زیبا کے توان کرد | وگر برخود کند دیبائے مُعْلَم
اگر مردم ہمین بالا و ریش اند | بہ نیزہ نیز بربستہ ست پرچم
چنین پند از پدر نشنیدہ باشی | الا گر ہوشیاری بشنو از عم
چو یزدانت مکرم کرد مخصوص | چنان زی درمیانِ خلق عالم
کہ گر وقتے میانِ بادشاہیست | نباشد ہمچنان باشی مکرم
نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ | سخن ملکے ست سعدی را مسلّم
مقامات از دو بیرون نیست فردا | بہشت جاودانی ۔ یا جہنم

سلجوق شاہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اُس کی مدح کو ایک اور قصیدہ میں اس طرح ختم کیا ہے۔

جہان نماند و آثارِ مملکت ماند | بخیر کوش و صلاح و بعدل کوش و کرم
کہ ملک و دولتِ ضحاک بیگنہ آزار | نماند و تا بہ قیامت برو بماند رقم
خطاے بندہ نگیری کہ مہتران و ملوک | شنیدہ اند نصیحت ز کہتران خدم
خنک کسیکہ پس ازوے حدیث خیر کنند | کہ جز حدیث نمی ماند از بنی آدم

اِن کے سوائے جو قصیدے خواجہ شمس الدین جوینی صاحب دیوان اور اُس کے بھائی خواجہ علاء الدین جوینی اور مجد الدین رومی اور فخر الدین ابوبکر وغیرہم کی شان میں ہیں۔ اُن میں مدح اکثر برائے نام ہے زیادہ تر نصیحت و پند ہے اور بہت سے قصیدے ایسے بھی ہیں جو کسی کی مدح میں نہیں ہیں اُن میں صرف نصائح و مواعظ یا فصل بہار کا سماں یا معشوق کی تعریف یا حمدِ الٰہی وغیرہ مندرج ہے۔

ایک مختصر قصیدہ اول سے آخر تک بھی اِس مقام پر نقل کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو مدح اور نصیحت دونوں کا ڈھنگ معلوم ہو۔

مدح وموعظۂ مجدالدین رومی

جهان بر آب نهادست زندگی بر باد — غلامِ همتِ آنم که دل برو نه نهاد
جهان نماند و خرم روان آدمے — که باز ماند ازو در جهان به نیکی یاد
سرائے دولت باقی نعیم آخرت ست — زمین سخت نگه کن چو می نهی بنیاد
کدام عیش درین بوستان که بادِ اجل — ہمے برآورد از بیخ قامتِ شمشاد
حیات عاریتے خانه ایست در ره سیل — چراغ عمر نهاده است بر دریچۂ باد
بسے برآید و بے ما فرو شود خورشید — بهارگاه خزان باشد و گہے مرداد
هرآنچه میگزرد دل منه که دجله بسے — پس از خلیفه بخواهد گزشت در بغداد
گرت نه دست برآید چو نخل باش کریم — ورت بدست نباشد چو سرو باش آزاد
بسے بدیدۂ حسرت ز پس نگاه کند — کسیکه برگ قیامت ز پیش نفرستاد
وجودِ خلق بدل میکند ورنه زمین — همان ولایت کیخسرو ست ملک قباد
چو طفل بر همه بازید و برهمه خندید — عجب تر آنکه نه کشتند دیگران اُستاد
عروس ملک نکو روئے دختریست ولے — وفا نمے کند این ست مهر بادا باد
نه خود سریر سلیمان بباد رفتے و پس — که هر کجا که سریریست می رود برباد
همین نصیحت من گوشدار و نیکی کن — که دانم از پس مرگم کنی به نیکی یاد
نداشت چشم بصیرت که گرد کرد و نخورد — ببرد گوے سعادت که صرف کرد و بداد
چنان که صاحب فرخنده رائے مجدالدین — که بیخ اجر نشاند و بنائے خیر نهاد
نگویمت به تکلف فلان بدولت و دین — سپهر مجد و معَالی جهان دانش و داد
تو آن برادر صاحبدلی که مادرِ دهر — به سالها چو فرزند نیکبخت نه زاد
به روزگار تو ایام دست فتنه به بست — به یمن تو درِ اقبال بر جهان بکشاد

دلیل آنکہ ترا از خدائے نیک آید | بس ست خلق جہان را کہ از تو نیک افتاد
یکے دعا گُنمت بے رعونت از سر صدق | خدات در نفس آخرین بیامرزاد
تو ہم زیان نہ کنی گر بصدقِ دل گوئی | کہ آفرین خدا بر روان سعدی باد

ایک ترجیع بند کے کچھ اشعار بھی جو کہ شیخ نے سعد[1] بن بوبکر کے مرثیہ میں لکھے ہیں اور جو کلیات میں غلطی سے امیر فخر الدین ابوبکر کے نام پر لکھ دیا گیا ہے بطور نمونہ کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

غریبان را دل از بہر تو خون ست | دل خویشان نمی دانم کہ چون ست
عنانِ گریہ چون شاید گرفتن | کہ از دستِ شکیبائی برون ست
مگر شاہنشہ اندر قلب لشکر | نمی آید کہ رایت سرنگون ست
شکیبائی مجو از جان مہجور | کہ بار از طاقتِ مسکین فزون ست
سکون در آتش سوزندہ گفتم | نشاید کرد ، درمان ہم سکون ست
کہ دُنیا صاحبے بد عہد و خونخوار | زمانہ مادرے بے مہر و دون ست
نہ اکنون ست بر ما جور لیّام | کہ از دورانِ آدم تا کنون ست

نمی دانم حدیث نامہ چون است
ہمی بینم کہ عنوانش بخون ست

بزرگان چشم و دِل در انتظار اند | عزیزان وقت و ساعت می شمارند

1۔ امیر فخر الدین ابوبکر اتابک ابوبکر کے امرائے نامدار میں سے تھا جو ادنیٰ درجے سے منصب امارت بلکہ مشارکتِ ملک تک پہنچا تھا اور سعد ابوبکر اتابک کا بیٹا تھا جس زمانہ میں ہلاکو خان نے بغداد کو فتح کیا تھا ابوبکر نے اپنے بیٹے سعد ابوبکر کو اظہار دوستی و خیر خواہی کے لیے بغداد میں بھیجا تھا جب وہاں سے باعزاز تمام رخصت ہوا تو راہ میں باپ کے مرنے کی خبر سنی جس سے اور ولی عہدوں کی طرح اُس کو خوش ہونا چاہیے تھا مگر اُس کو اِس خبر سے ایسا صدمہ ہوا کہ راہ ہی میں سخت بیمار ہو گیا اور رستے ہی میں باپ کی وفات سے بارہ روز بعد مر گیا۔ اُس کی سوُنی جب شیراز میں آئی تو شیخ نے یہ مرثیہ لکھا ہے جیسا کہ ترجیع کے شعر سے ظاہر ہے۔ سعد کے بعد اُس کا بیٹا اتابک محمد مظفر اُس کا جانشیں ہوا۔

غلامان دُر و گوهر می فشانند   کنیزان دست و ساعد می نگارند
ملک خان و مساق و بدر و ترخان   برهوارانِ تازی بر سوارند
که شاهنشاه عادل سعد بوبکر   به ایوانِ شهنشاهی درآرند
حرم شادی کنان بر طاق و ایوان   که مروارید بر تاجش بپارند
زمین می گفت عیشے خوش گزاریم   ازان پس آسمان گفت آز گزارند
امید تاج و تختِ خسروی بود   ازین غافل که تابوتش درآرند
چه شد پاکیزه رویان حرم را   که بر سر گاه بر زیور غبارند
نشاید پاره کردن زیور دروے   که مردم تحتِ امرِ کردگارند
و لیکن باچنین داغ جگر سوز   نمی شاید که فریادے ندارند
دلے شاید که مهجوران بگریند   روا باشد که مظلومان بزارند

نمی دانم حدیث نامه چون ست
همی بینم که عنوانش بخون ست

پس از مرگِ جوانان گل مماناد   پس از گل در چمن بلبل مخواناد
کس اندر زندگانی قیمت دوست   نداند، کس چنین قیمت مداناد
سرآمد روزگار سعدِ بوبکر   خداوندش برحمت در رساناد
به تلخی رفت از دنیاے شیرین   زلال کام در حلقش چکاناد
جزاۓ مرده رفتن در غریبی   شراب از دستِ پیغمبر ستاناد
درین گیتی مظفر شاهِ عادل   محمد نام بردارش بماناد
سعادت پرتوِ نیکان دهادش   بخوے صالحانش پروراناد
روانِ سعد را با جانِ بوبکر   به اوج روح و راحت گستراناد
بکام دوستان و بخت و فیروز   بسے دوران دیگر بگوراناد

نمی دانم حدیثِ نامه چون ست
همی بینم که عنوانش بخون ست

صاحبیہ

یہ مجموعہ شیخ کے متفرق اشعار کا سو صفحہ کے قریب ہے جس میں قطعہ، رباعی، فرد، ملمع، مثنوی وغیرہ جمع کی گئی ہیں۔ چونکہ شیخ کے ساتھ خواجہ شمس الدین حسین صاحب دیوان کو کمال خلوص اور عقیدت تھی اِس لیے شیخ نے اِس مجموعہ کا نام صاحبیہ رکھا۔

اِن اشعار میں کوئی نئی خصوصیت نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے بیشتر اشعار نصیحت و پند پر اور کسی قدر حسن و عشق کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ چند قطعے اور رباعیاں جو سرسری نظر میں اچھی معلوم ہوئیں نقل کی جاتی ہیں۔

قطعات

تفرس کسان

نا کسان را فراستے ست عظیم ‏ ‏ گرچہ تاریک طبع و بد خویند

چون دو کس مشورت کنند بہم ‏ ‏ گوید این عیب من ہمی گویند

☆☆☆

خصائل سگان

سگے شکایتِ ایام با یکے میگفت ‏ ‏ نہ بینم کہ چہ برگشتہ حال و مسکینم

نہ آشیانہ چو مرغان نہ غلّہ چون موران ‏ ‏ قناعتم صفت و بردباری آئینم

گرم دہند خورم ورنہ میروم آزاد ‏ ‏ نہ ہم چو آدمیان خشمناک بنشینم

مرا نہ برگ زمستان نہ عیش تابستان ‏ ‏ کفایت ست ہمین پوستین پارینم

نہ در ریاضت و خلوت مقام میسازم ‏ ‏ کہ جایگاہ کلوخ ست و سنگ بالینم

بہ لقمۂ کہ تناول کنم ز دست کسے ‏ ‏ رواست گر بزند بعد ازان بہ ژوپینم

چو گربہ ور نہ ربایم زدست مردم چیز — دور اوفتادہ بود ریزہ ریزہ بر چینم
بجاے من کہ نشنید کہ در مقام رضا — برابر ست گلستان و تل سر گینم
مرا کہ سیرت ازین جنس و خو بدین صفت ست — چہ کردہ ام کہ سزاوار سنگ و نفرینم
جواب داد کزین بیش نعتِ خویش مگو — کہ خیرہ گشت زو صفت زبانِ تحسینم
ہمین دو خصلت ملعون کفایتت کہ ترا — غریب دشمن و مُردار خوار مے بینم

☆☆☆

راحت بعد از مشقت

نظر کردم بہ چشم راے و تدبیر — ندیدم بہ زخاموشی خصالے
نگویم لب بہ بند و دیدہ بردوز — و لیکن ہر مقامے را مقالے
زمانے بحث علم و درس و تنزیل — کہ باشد نفس انسان را کمالے
زمانے شعر و شطرنج و حکایت — کہ خاطر را بود دفع ملالے
خدایست آنکہ ذاتِ بے مثالش — نگردد ہرگز از حالے بحالے

☆☆☆

ہمدردی بنی نوع

رحم اللہ معشر الماضین — کہ بمردی قدم سپردندے
راحتِ نفس بندگان خداے — راحتِ جان خود شمردندے
آن عزیزان چو زندہ می نشوند — کاش این نا کسان بمردندے

☆☆☆

انجام ظالمان

بس دست دعا بر آسمان بود — تا پائے برآمدت بہ سنگے
اے گرگ نہ گفتمت کہ روزے — ناگہ بہ سر افتدت پلنگے

☆☆☆

حقوق پدران

اے طفل کہ دفعِ مگس از خود نتوانی — ہرچند کہ بالغ شدی آخر نہ ہمانی

شکرانۂ زور آوری روز جوانی آنست کہ قدر پدرِ پیر بدانی

☆☆☆

شانِ رزاقی

صانع نقش بند بے مانند کہ ہمہ نقش او نکو آید
رزقِ طائر نہاد در پر و بال کہ بہر طعمۂ فرو آید
روزی عنکبوت را بہ مگس پر دہد تا بہ نزد او آید

☆☆☆

ولی خائن

الحق اُمنائے مال ایتام ہیچون تو حلال زادہ یابند
ہرگز زن و مردِ کفر و اسلام نفس از تو پلید تر نہ زایند
طفلانِ ترا پدر بمیراد تا جور وصی بیازمایندٗ
اطفالِ عزیز ناز پرورد از دست تو دست بر خدایند

☆☆☆

ظالم محتاط درحق خود

امیر ما عَسَل از دستِ خلق می نخورد کہ زہر در قدحِ انگبیں تواند بود
عجب کہ در عسل از زہر میکند پرہیز حذر نمیکند از تیر آہ زہر آلود

☆☆☆

ترحم بر بیوگان

شنیدم کہ بیوہ زنے دردمند ہمے گفت و رخ بر زمین می نہاد
ہر آن کدخدا را کہ بر بیوہ زن ترحم نباشد زنش بیوہ باد

☆☆☆

منع دشنام

ہر بد کہ بخود نمی پسندی باکس مکن اے برادرِ من
گر مادرِ خویش دوست داری دشنام مدہ بہ مادرِ من

مدافعت دشمن

مقابلت نکند با حجر بہ پیشانی | مگر کسے کہ تہوّر کند بنادانی
کس این خطا نہ پسندد کہ دفع دشمن خود | توانی و نکنی یا کُنی و نتوانی

☆☆☆

مطائبہ

شنیدہ ام کہ فقیہے بہ دشتبانے گفت | کہ ہیچ خربزہ داری رمیدہ وگفت آرے
ازین طرف دو بہ دانگے، گر اختیار کنی | وزن آن، چہار بہ دانگے قیاس کن بارے
سوال کرد کہ چندین تفاوت از پئے چیست | کہ فرق نیست میان دو نوع بسیارے
بگفت ازانچہ تو بینی حلال وملکِ من است | نیامدہ ست بدستم بوجہ آزارے
وزان دگر پسرانم بغارت آوردند | حرام را نبود نزد شرع مقدارے
فقیہ گفت۔ حکایت دراز خواہی کرد | ازین حرامترت ہست صد بہ دینارے

☆☆☆

امتحان دوستی

تا سگان را وجوہ پیدا نیست | مشفق و مہربانِ یک دگر اند
لقمۂ درمیان شان انداز | کہ تہی گاہ یکدگر بدرند

☆☆☆

رباعیات

پاس عہد

شب نیست کہ چشم آرزومند تو نیست   وین جان بلب رسیدہ دربند تو نیست
گر تو دگرے بجائے من بگزینی   من عہدِ تو نشکنم کہ مانند تو نیست

☆☆☆

تاسف بر عمر گزشتہ

ماہی اُمید عمرم از شست برفت   بے فائدہ روزم چو شب سُست برفت
عمرے کہ ازو دمے بجانے ارزد   افسوس کہ رائگانم از دست برفت

☆☆☆

انجام ظالم

از بس کہ بیازرد دل دشمن و دوست   گوئی بگناہِ مسخ کردندش پوست
وقتے غمِ او بر دلہا بودے   اکنون ہمہ غم ہائے جہان بر دل اوست

☆☆☆

فضل دوست بر ہمہ چیز

گویند ہوائے فصلِ آواز خوش است   بوے گل و بانگِ مرغ گلزار خوش است
ابریشم زیر و نالۂ زار خوش است   اے بے خبران این ہمہ بایار خوش است

☆☆☆

مجبوری عاشق

گویند مرد درپے آن سرو بلند   انگشت نماے خلق بودن تا چند
بے فائدہ پندم مدہ اے دانشمند   من چون نروم کہ مے برندم بہ کمند

خوفِ مرگ

آہو برہ را کہ شیر درپئے باشد　　بیچارہ چہ اعتماد بروے باشد
این ملخ در آب چند بتواند بود　　وین برف در آفتاب تا کے باشد

☆☆☆

توحید

آنرا کہ نظر بروئے ہر کس باشد　　در دیدۂ صاحب نظران خس باشد
قاضی بہ دو شاہد بدہد فتویٰ شرع　　در مذہبِ عشق شاہدے بس باشد

☆☆☆

ریاضت کشان

مردان ہمہ عمر پارہ بر دوختہ اند　　قوتے بہزار حیلہ اندوختہ اند
فردائے قیامت بگناہ ایشان را　　باشد نہ سوزند کہ خود سوختہ اند

☆☆☆

مطائبہ

با دوست بگرما بہ درم خلوت بود　　وان روے گلینش گلِ حمام آلود
گفتا دگر این روے کسے دارد دوست　　گفتم بگلِ آفتاب نتوان اندود

☆☆☆

غرورِ حسن

چون صورت خویشتن در آئینہ بدید　　وان کام و دہان و لب و دندان بگزید
میگفت چنانکہ میتوانست شنید　　بس جان بلب آمد کہ بدین لب نرسید

☆☆☆

انتظار

امشب نہ بیاضِ روز بر می آید　　نہ نالۂ مرغانِ سحر می آید
بیدار نشستہ ام نظر بر سرِ کوہ　　تا صبح کہ از سنگ بدر می آید

☆☆☆

فصل خزان

وقت ست کہ چشمِ فتنہ خوابش ببرد   باد از رخِ گل حُسن شبابش ببرد
گل وقت رسیدن آب عطّار ببرد   عطار بوقتِ رفتن آبش ببرد

☆☆☆

فصلِ بہار

وقتِ گل و روز شادمانی آمد   ہنگامِ نشاط و کامرانی آمد
آن شد کہ بسرما نتوانی آمد   سرما شد و وقتِ مہربانی آمد

☆☆☆

عظمت عاشق و معشوق

ما چاکر آنیم کہ دل برباید   یا دل بہ کسے دہد کہ جان آساید
آنکس کہ نہ عاشق و نہ معشوق کس ست   در ملک خدا اگر نباشد شاید

☆☆☆

بے ثباتی زندگانی

آن گل کہ ہنوز نو بدشت آمدہ بود   نشگفتہ تمام، باد مہرش بربود
بیچارہ بسے امید در خاطر داشت   اُمید دراز و عمر کوتاہ چہ سود

☆☆☆

حسرت

من دوش قضا یار و قدر پشتم بود   نارنج ز نخدان تو در مشتم بود
دیدم کہ ہمی گزم لب شیرینت   بیدار چہ گشتم سر انگشتم بود

☆☆☆

صلح با دشمن قوی

چون خیل توصد باشد و خصمِ تو ہزار   خود را بہ ہلاک می سپاری زنہار
تا بتوانی برآور از خصم دمار   چون جنگ ندانی آشتی عیب مدار

☆☆☆

ناگریز بودن معشوق

نامردم اگر زنم سر از مہر تو باز   خواہی باشم بجور و خواہی بنواز
ور بگریزم ز دستت اے مایۂ ناز   ہر جا کہ روم پیش تو می آیم باز

☆☆☆

صدقِ طلب

تا سر نہ کنم در سرت اے مایۂ ناز   کوتہ نہ کنم نہ دامنت دستِ نیاز
ہرچند کہ راہم بتو دورست و دراز   در راہ بمیرم و نگردم ز تو باز

☆☆☆

خوبرویان را دوست داشتن

گر بے خبران و عیب گویان از پس   منسوب کنندم بہواؤ بہوس
آخر نہ گناہ است کہ من کردم و بس   منظور ملیح ـ دوست دارد ہمہ کس

☆☆☆

حفظ جان از مہالک

چون زہرۂ شیران ببرد نعرۂ کوس   برباد مدہ جانِ گرامی بہ فسوس
باآنکہ خصومت نتوان کرد بساز   دستے کہ بقوت نتوان برد ببوس

☆☆☆

معاملت با دوست

یا ہمچو ہماے بر من افگن پر خویش   تا بندگیت کنم بجان و سر خویش
در لایقِ خدمتم ندانی بر خویش   گو من سرِ خویش گیرم و کشور خویش

☆☆☆

ہمسائگی نیکان و بدان

ہمسایہ کہ میلِ طبع باشد سویش   فردوس برین بود سرا در کویش
وان را کہ نخواہی کہ بہ بینی رویش   دوزخ باشد بہشت در پہلویش

☆☆☆

حسرت جوانی در پیری

هر سرو قدے کہ بگورد در نظرم　　در ہیہات او خیرہ بماند بصرم
چون من نتوانم کہ جوان گردم باز　　آخرکم ازآنکہ در جوانان نگرم

☆☆☆

سختی صدمۂ فراق

خود را بمقام شیرے دانستم　　چون خصم آمدبہ روبہے مانستم
گفتم، من و صبر، اگر بود روز فراق　　چون واقعہ افتاد نتوانستم

☆☆☆

تاسف برعمر گزشتہ

شبہا ز ہمہ خلق نہان می گریم　　چشم از غمِ دل بر آسمان می گریم
طفل از غم مرغ رفتہ چون گریہ کند　　بر عمرِ گزشتہ ہمچنان می گریم

☆☆☆

امتناع از خوردہ گیری

چون ما و شما اقارب یکدگریم　　بہ زان نبود کہ پردۂ ہم ندریم
اے خواجہ تو عیب من مکن تا من نیز　　عیب تو نگویم کہ یک از یک تبریم

☆☆☆

خواہش جنگ بامید معانقہ

گر بر رگِ جان زشت آید تیرم　　چہ خوشتر ازآنکہ پیش دستت میرم
دل با تو خصومت آرزو میکندم　　تا صلح کنی و در کنارت گیرم

☆☆☆

حضورِ دوست

می آئی و لطف و کرمت می بینم　　و آسایش جان در قدمت می بینم
وان وقت کہ غائبی ہمت می بینم　　ہرجاکہ نگہ می کنمت می بینم

☆☆☆

تحاشی از توبہ

گفتم کہ دگر چشم بہ دلبر نہ کنم   صوفی شوم و گوش بہ منکر نہ کنم
دیدم کہ خلاف طبع موزونِ من است   توبہ کردم کو توبہٗ دیگر نہ کنم

☆☆☆

دشواری مواصلت

مہ راز فلک بطرف بام آوردن   و ز روم کلیسیا بشام آوردن
در وقتِ سحر نماز شام آوردن   بتوان نتوان ترا بدام آوردن

☆☆☆

دلیل عدم وصول الی اللہ

نہ سرو توان گفت نہ خورشید و نہ ماہ   آہ از تو کہ در وصف نمی آئی آہ
ہر کس برہے میرود اندر طلبت   گر رہ بتو بودے نہ بدے اینہمہ راہ

☆☆☆

سیر نشدن از دوست

اے راہ روان را گزر از کوے تو نہ   با بیخبر از عشق و گزر سوے تو نہ
ہر تشنہ کہ از دستِ تو بستاند آب   از دستِ تو سیر گردد از روے تو نہ

☆☆☆

فراموش نکردن در غیبت

اے یار کجائی کہ در آغوش نہٗ   و امشب برِ ما نشستہ چون دوش نہٗ
اے سرو بلند و راحتِ جسم و روان   ہر چند کہ غائبی فراموش نہٗ

☆☆☆

شکایت از دیدہ و دل

اے کاج نکردے نگاہ از دیدہ   بر دل نہ زدے عشق تو راہ از دیدہ
تقصیر ز دل بود گناہ از دیدہ   آہ از دل و صد ہزار آہ از دیدہ

☆☆☆

طلب عنایت از دوست

روزے دو سہ شد کہ بندہ ننواختہ و اندیشہ بہ ذکر ما نہ پرداختہ
زان می ترسم کہ دشمنان اندیشند کز چشم عنایتم بینداختہ

☆☆☆

دشواری ترک نظر

گفتم کہ کنم توبہ زصاحب نظری باشد کہ بلائے عشق گردد سپری
چندانکہ نگہ می کنم اے رشکِ پری بار دومین ز اولین خوب تری

☆☆☆

در بلائے عظیم از اندک ضرر ترسیدن

گویند کہ دوش شحنگان تتری وزدے بگرفتند بصد حیلہ گری
امروز بہ آویختنش می بردند میگفت رہا کن کہ گریبان بدری

☆☆☆

عشق فطری

گیرم کہ بہ فتوائے خردمندی ورائے از دائرہ شرع برون ننہم پائے
با میل کہ طبع می کند چہ توان کرد عیبے ست کہ درمن آفریدہ خدائے

☆☆☆

مفردات

فرزندان ناخلف

دانی چہ گفتہ اند بنی عوف در عرب — نسل بریدہ بہ کہ موالید بے ادب

ترکِ ماسوا

تو آتش بہ نے درزن و درگزر — کہ نہ خشک در بیشہ ماند نہ تر

زور آزمائی بر ضعفا

مروّت نہ باشد بہ افتادہ زور — بَرَد مرغ دون دانہ از پیش مور

موافقت روزگار

خواہی کہ بہ طبعت ہمہ کس دارد دوست — با ہر کہ در اوفتی چنان باش کہ اوست

معنی ہدایت وضلالت

گر راہ نمائی ہمہ عالم راہ است — در دست نہ گیری ہمہ عالم چاہ است

حوادث ناگہانی

نہالے کہ سی سال گردد درخت — ز بیخش برآرد یکے باد سخت

صحبت ناجنس

اگر نواب دسر ہنگان ہم از درگہ برانندت — ازان بہتر کہ در پہلوے مجہولے نشانندت

موافقت وقت

سلطان چو بہ منزلِ گدایان آید — گر بر سر بوریا نشیند شاید

شان ضعفا

گر ز ہفت آسمان گزند آید — ہمہ بر عفوِ دردمند آید

فرق در مشقت و مصیبت

اگر دندان نباشد نان توان خورد | مصیبت آن بود کت نان نباشد

خاصہ گدایان

منعم کہ نظر بحالِ درویش کند | چندانکہ کرم کند طمع بیش کند

اعتدال در تواضع

تواضع گرچہ محمود است و فضل بیکران دارد | نشاید کرد بیش از حد کہ ہیبت را زیان دارد

دوگونہ یاس بعد از امید

گفتم کہ برآید آبے از چاہ امید | افسوس کہ دَلو نیز در چاہ افتاد

مسافر نوازی

بشکر آنکہ تو در خانۂ و اہلت پیش | نظر دریغ مدار از مسافر درویش

فرق در عاقل و نادان

کوتہ نظران را نبود جز غمِ خویش | صاحب نظران را غمِ بیگانہ و خویش

تحمل

گر بلندت کسے دہد دشنام | بہ کہ ساکن دہی جواب سلام

ناصح تجربہ کار

بشنو کہ من نصیحت پیران شنودہ ام | بیش از تو خلق دیدہ و بیش از تو بودہ ام

دلداری برائے دل آزاری

از بہر دل کسے بدست آوردن | مطبوع نباشد دگرے آزردن

جزائے

جو بد گفتی مباش ایمن ز بدگو | کہ بد را کس نخواہد گفت نیکو

عالم مفلس

صاحبدل و نیک سیرت و علامہ | گو کفش دریدہ باش و خلقان جامہ

اعتدال در سخا

کرم بجائے فرو ماندگان جو بتوانی | مروّت است نہ چندانکہ خود فرو مانی

تغییر مردانگی

مردی نہ بقوت است و شمشیرزنی آنست کہ ظلمے کہ توانی نہ کنی

استحکام دوستی

تو باما روز و شب در باغ اُنسی خلاف است اینکہ طول العہد ینسی

ہدیہ ضعفا

پائے ملخے نزد سلیمان بردن عیب است ولیکن ہنر است از مورے

نصیحت ناشنودن

من سخن راست نوشتم تو اگر راست نخوانی جرم لجلاج نباشد چو تو شطرنج ندانی

ختم کلام

کتبت لیبقی الذّکر فی امم بعدی

فیا ذا الجلال اغفر لکاتبه السعدی

مطائبات و ہزلیات و مضحکات

شیخ کی کلیات کا سب سے اخیر حصّہ مجموعۂ ہزلیات ہے جو تیس بتیس صفحہ سے زیادہ نہ ہوگا۔ یہ مجموعہ فی الحقیقت شیخ کے عارضِ کمال پر ایک نہایت بدنما مسّہ ہے جو شیخ کی شان سے نہایت بعید اور اُس کے فضل و کمال و بزرگی کے بالکل منافی ہے۔ اِس میں زیادہ تر نظم اور کسی قدر نثر ہے اور کہیں کہیں عربی عبارت بھی ہے۔ حضرت نے اِس حصہ میں اپنی شیخوخت اور تقدس کو بالائے طاق رکھ کر خوب آزادی اور بیبا کی سے دل کھول کر فحش اور ہزل کی داد دی ہے جس پر ہرگز یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ یہ پوچ اور لغو اور بیہودہ کلام اُس شخص کا ہے جس کے نتائج افکار سے گلستان اور بوستان جیسی بے بہا کتابیں موجود ہیں۔ آدمی کا خطاوار اور ناقص ہونا یہی اُس کے انسان ہونے کی علامت ہے اور اُس کے اقوال و افعال کا تفاوت اور اختلاف اور اُن کا ہمیشہ ایک ضابطہ اور ایک قانون کے موافق سرزد نہ ہونا یہی وہ چیز ہے جو اُس کو دیگر حیوانات سے تمیز دیتی ہے۔ انسان کے خیالات کو ایک نادان بچہ کی حرکتوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس کی ایک حرکت پر بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے اور دوسری حرکت پر حد سے زیادہ غصہ آتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ شیخ کی طبیعت پر ظرافت اور مزاح غالب تھا اور جب یہ صفت حد سے گزر جاتی ہے تو اِس سے فحش اور ہزل پیدا ہوتا ہے۔ مگر شیخ نے اس مجموعہ کے شروع میں چند سطریں معذرت آمیز عربی عبارت میں لکھی ہیں جو قابلِ لحاظ ہیں وہ لکھتا ہے کہ **اَلزَمَنی بَعضُ اَبناَءِ المُلُوکِ اَن اُصَنِّفَ لَه' کِتاباً فِی الھَزلِ عَلی طَرِیقِ السُّوزَنِی فَلَمْ اُجِبْهُ فَھَدَّدَنِی بِالقَتْلِ فَلاَجَلِ ذٰلِکَ اَجَبتُ اَمرَه' و اَنشَدتُ ھٰذِهِ الاَبیَاتِ وَ اَنَا اَستَغفِرُ اللّٰهَ العَظِیمَ.** یعنی ایک بادشاہزادہ نے مجھ کو اس بات پر مجبور کیا کہ میں اُس کے لیے ایک کتاب حکیم سوزنی کی روش پر ہزل میں لکھوں۔ میں نے نہ مانا اِس پر اُس نے مجھ کو قتل کی دھمکی دی۔ اِس لیے ماننا پڑا اور یہ اشعار لکھے۔ اور

میں خدائے بزرگ سے توبہ واستغفار کرتا ہوں۔

شیخ کا عذر جہاں تک ہماری راے ناقص میں آتا ہے بہت قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ شیخ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ہمیشہ سیر وسفر میں رہتا تھا۔ تاتار سے لے کر روم ومصر وحبش تک اُس کی جولان گاہ تھی اُس کی شاعری اور نکتہ سنجی کا شہرہ اُس کی زندگی ہی میں دور دور پہنچ گیا تھا۔ مسلمان امیرزادوں اور بادشاہوں کی صحبتوں میں لہو ولعب اور تمسخر واستہزا کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ پس اگر کسی نالائق بادشاہزادے نے شیخ کی ظرافت اور بذلہ سنجی کا شہرہ سن کر اس خیال سے کہ ہمیشہ گرمیِ صحبت کے لیے ایک مجموعۂ ہزل وفحش موجود رہے شیخ کو اِن ہفوات کے لکھنے پر مجبور کیا ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ اور چونکہ اِس مجموعہ میں صریح فحش اور علانیہ پھکڑ کے سوا بامزا اور لطیف خیالات جیسے کہ شیخ کے کلام کی عام خاصیت ہے بہت کم پائے جاتے ہیں اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ تمام ہزلیات دل کی اُپج اور طبیعت کی اُمنگ سے نہیں بلکہ محض نفرت وکراہت کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔

ایران میں ہزل وفحش کی شاعری دورۂ غزنویہ کے شعرا سے برابر چلی آتی تھی اور یہ طریقہ اس قدر عام اور بے عیب ہو گیا تھا کہ افاضل شعرا کی عظمت اور بزرگی میں اس سے کچھ فرق نہ آتا تھا۔ اکثر ہاجی اور ہزال حکیم کے لقب سے ملقب ہوتے تھے اور اب تک جیسے حکیم انوری، حکیم خاقانی، حکیم شفائی، حکیم قاآنی وغیرہ وغیرہ۔ سوزنی بھی جو چھٹی صدی کا شاعر ہے اور جس کا ذکر شیخ کی مذکورہ بالا عبارت میں ہے حکیم سوزنی کہلاتا تھا۔ اس کا ہزل اور فحش انتہا درجے کو پہنچ گیا تھا۔ اس نے حکیم سنائی کی بہت سی ہجویں لکھی ہیں اور حکیم صاحب نے بھی باایں ہمہ مشیخت وتقدس تنگ آ کر اُس کے جواب میں ایسی جامع ومانع گالی تصنیف فرمائی ہے جو سوزنی کی عمر بھر کی گالیوں اور پھکڑ کا جواب ہو سکتی ہے۔ حکیم ابوالعلائی گنجوی جو منوچہر شروان شاہ کے عہد میں پایۂ تخت کا ملک الشعرا تھا۔ باوجودیکہ وہ حکیم خاقانی کا مربّی اور خسر تھا اُس کے اور خاقانی کے باہم ایسی رکیک اور نالائق ہجو بازی ہوتی تھی جس کی تصریح کرنے سے شرم آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بُرائی سوسائٹی میں اس قدر عام اور بے عیب ہو جائے اُس سے بالکل پاک اور مبرّا رہنا بشر کی معمولی طاقت سے باہر ہے اور اُس کے ارتکاب پر ایسا سخت مواخذہ نہیں کیا جا سکتا۔ جس کا وہ عیب فی نفسہ مستحق ہے۔

ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے عنفوان شباب میں جو شوخی اور بیبا کی کا زمانہ ہے کسی موقع پر یہ خرافات بھی لکھ دی ہوگی۔ اور ایسا کم و بیش ہر شخص سے ظہور میں آتا ہے۔ مگر کوئی شخص ایسے بیہودہ اور لغو کلام کو اپنی تصنیفات میں شامل کر کے اپنی طرف منسوب اور اپنے نام سے شایع نہیں کرنا چاہتا۔ شیخ نے بھی یقیناً ایسا ہرگز نہ چاہا ہوگا مگر چونکہ وہ زمرۂ مشایخ و عرفا میں سے گنا جاتا تھا اور معتقدین کے نزدیک اُس کا ہزل بھی انوار و برکات سے خالی نہ تھا اس لیے کسی بزرگوار نے اُس کی وفات کے بعد اِس ناشدنی مجموعہ کو بھی تبرکاً و تیمناً کلیات میں داخل کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ گلستان کے مرتب ہونے سے پہلے لکھا جا چکا تھا کیونکہ اِس کے چند اشعار جن میں زیادہ ہزل نہیں ہے۔ شیخ نے گلستان میں اپنے اپنے موقع پر نقل کیے ہیں۔

ہم کو بہت تجسس سے چند رباعیاں اور قطعے اِس مجموعہ میں ایسے ملے ہیں جو فحش سے پاک ہیں سو وہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

رباعیات

انجام حسنِ نوخطان

آن عہد بیاد داری و دولت و داد — کز عاشق بیچارہ نمے کردی یاد
انگہ بگریختی کہ کس چون تو نبود — وامروز بیامدی کہ کس چون تو مباد

ایضاً

آن ماہ کہ گفتی ملکِ رحمان ست — این بار اگرش نگہ کنی شیطان ست
روے کہ چو آتش بزمستان خوش بود — امروز چو پوستین بہ تابستان ست

قطعات

تقویٰ بضرورت

چو خویشتن نتواند کہ می خورد قاضی — ضرورت ست کہ بر دیگران بگیرد سخت
کہ گفت پیرہ زن از میوہ میکند پرہیز — دروغ گفت۔ کہ دستش نمیرسد بہ درخت

تاسف در بلائے عظیم بر قوت اندک

مردکے غرقہ بود در جیحون   کز سمرقند بود پندارم
بانگ می کرد و زار می نالید   کاے دریغا کلاہ و دستارم

توبہ ضعف و پیری

حریف عمر بسر بردہ در فسوق و فجور   بوقت مرگِ پشیمان ہمی خورد سوگند
کہ توبہ کردم و دیگر گنہ نخواہم کرد   تو خود دگر نتوانی بریش خویش مخند

☆☆☆

عربی قصائد اور مقطعات

کلیاتِ شیخ میں بیس صفحہ کے قریب قصیدے اور قطعے بھی شامل ہیں اور اِن کے سوا اُس کے ملمعات میں عربی اشعار اور مصرعے کثرت سے موجود ہیں۔ گلستان میں بھی جیسا کہ اُس نے خاتمہ میں تصریح کی ہے تقریباً تمام عربی اشعار اُسی کے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ اُس کی عمر کا ایک بڑا حصہ دیارِ عرب میں بسر ہوا تھا اور عربی زبان بمنزلہ مادری زبان کے ہوگئی تھی اُس کے تمام فارسی اور عربی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل علم کے بعد اُس نے زیادہ تر اپنی توجہ دینیات اور تصوف اور علم ادب میں مصروف کی تھی۔ گو اُس کا عربی کلام بہت تھوڑا ہے مگر جس قدر ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مشاق اور ماہر ادیب کا ہونا چاہیے بایں ہمہ وہ عربی شعر میں شاعری کا ادّعا نہیں کرتا چنانچہ بغداد کے مرثیہ میں لکھتا ہے۔

وَ بِـالشِّـعْـرِ اَیْـمُ اللّٰـهِ لَسْتُ بِمُدَّعٍ وَ لَـوْ کَـانَ عِنْدِیْ مَا بِبَابِلَ مِنْ سِحْرٍ	بخدا کہ میں شاعری کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اگر چہ میرے کلام میں وہ جادو موجود ہے جو بابل میں موجود تھا۔
هُـنَـا لِکَ نَـقَّـادُوْنَ عِلْماً وَ خُبْرَةً وَ مُنْتَخِبُوا الْقَوْلِ الْجَمِیْلِ مِنَ الْهَجْرِ	یہاں علم اور واقفیت کی رو سے پرکھنے والے اور عمدہ کلام کو بُرے کلام میں سے چھانٹنے والے موجود ہیں۔
جَـرَتْ عَبَـرَاتِـیْ فَوْقَ خَدِّیْ کَـآبَةً فَـاَنْشَـاْتُ هٰـذَا فِیْ قَـضِیَّةِ مَا یَجْرِیْ	سوز دل کے سبب میرے آنسو چہرہ پر ٹپک پڑے۔ سو میں نے یہ قصیدہ اِس سرگذشت کے بیان میں لکھ لیا۔

وَ لَو سَبَقَتنِی مسَادَۃٌ جَلَّ قدرُھُم لَمَا حَسُنَت مِنّی مجاوزۃ القدرِ	اگر ذی رتبہ لوگ اِس مضمون میں مجھ سے سبقت کرتے تو البتہ مجھ کو اپنے رتبہ سے تجاوز کرنا زیبا نہ تھا۔

بہر حال اُس کا عربی کلام جس قدر ہے اور جیسا ہے غنیمت ہے اور اس سے شیخ کی شاعری کا رتبہ سوایا بلکہ ڈیوڑھا ہو گیا ہے اب ہم اُس کے ایک طولانی قصیدہ میں سے جو کہ اُس نے خرابی بغداد پر لکھا ہے کچھ اشعار بطور نمونہ کے اِس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

حَبَستُ بِجَفنَی المَدَامِعَ لاَ تَجرِیٰ فَلَمَّا طَغَی المَاءُ استَطَالَ عَلَی السَّکرِ	میں نے اپنی پلکوں میں آنسوؤں کو روکا تھا کہ بہنے نہ پائیں پر جب پانی نے طغیانی کی تو اُس بند کو توڑ ڈالا۔
نَسِیمُ صَبَا بَغدَادَ بَعدَ خَرَابِھَا تَمَنَّیتُ لَو کَانَت تَمُرُّ عَلَی قَبرِیٰ	کاش ایسا ہوتا کہ بغداد کی تباہی کے بعد اُس کی ہوا کا جھوکا میری قبر پر گزرتا۔
لِاَنَّ ھَلاَکَ النَّفسِ عِندَاُولِی النُّھیٰ اَحَبُّ لَھُم مِن عَیشِ مُقبِضِ الصَّدرِ	کیونکہ عقلمندوں کے نزدیک مر جانا تنگدل جینے سے بہتر ہے۔
زَجَرتُ طَبِیبًا جَسَّ نَبضِیٰ مُدَاوِیاً اِلَیکَ فَمَا شَکوَایَ مِن مَّرَضٍ یَّبرِیٰ	میں نے طبیب کو جب کہ اُس نے علاج کے لیے میری نبض کو چھوا جھڑک دیا کہ جا اپنا کام کر مجھ کو ایسے مرض کی شکایت نہیں جو اچھا ہو سکے۔
لَزِمتُ اصطِبَارًا حَیثُ کُنتُ مُفَارِقًا وَ ھَذَا فِرَاقٌ لَّا یُعَالَجُ بِالصَّبرِ	میں نے ہمیشہ احباب کی جدائی میں صبر اختیار کیا ہے مگر یہ ایسی جدائی ہے جس کا علاج صبر سے ممکن نہیں۔
وَ لاَ تَسئَلَن عَمَّا جَرٰی یَومَ حَصرِھِم وَ ذٰلِکَ مِمَّا لَیسَ یَدخُلُ فِی حَصرِ	نہ پوچھو جو حال بنی عباس کی قید کے دن گزرا یہ وہ حال ہے جو قید بیان میں نہیں آ سکتا۔

عربی	اردو
اُدِيرَتْ كُؤُوسُ الْمَوْتِ حتى كَانَّه رُءُوسُ الْاَسَارٰى تَحَرَّكْنَ مِنَ السُّكْرِ	شرابِ مرگ کے جام گردش میں لائے گئے یہاں تک کہ قیدی کشتوں کے سر تڑپتے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے گویا نشے میں جنبش کر رہے ہیں۔
بَكَتْ جُدُرُ الْمُسْتَنْصِرِيَّةِ نُهْبَةً عَلَى الْعُلَمَآءِ الرَّاسِخِيْنَ ذَوِى الْحِجْرِ	علمائے راسخین پر جو کہ اصحاب عقل و دانش تھے مدرسہ مستنصریہ کی دیواریں زار زار رو رہی ہیں۔
مَحَابِرُ تَبْكِىْ بَعْدَهُمْ بِسَوَادِهَا وَ بَعْضُ قُلُوْبِ النَّاسِ اَمْلَكُ مِنْ حِبْرٍ	اُن کے بعد دواتیں اپنی سیاہی کے آنسوؤں سے روتی ہیں مگر بعض لوگوں کے دل دوات سے زیادہ سیاہ ہیں۔
نَوَائِبُ دَهْرٍ لَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَهَا وَ لَمْ اَرَ عُدْوَانَ السَّفِيْهِ عَلَى الْحِبْرِ	یہ زمانہ کے سخت حادثے ہیں کاش میں اِن سے پہلے مر جاتا اور جاہلوں کا ظلم دانشمندوں پر نہ دیکھتا۔
وَقَفْتُ بِعَبَّادَ انْ اَرْقُبُ دِجْلَةَ كَمِثْلِ دَمٍ قَانٍ تَسِيْلُ اِلَى الْبَحْرِ	میں نے شہر عبادان میں ٹھہر کر دجلہ کے پانی کو دیکھا کہ نکتر خون کی مانند سمندر کی طرف بہتا تھا۔
وَفَائِضُ دَمْعِي فِىْ مُصِيْبَةِ وَاسِطٍ يَزِيْدُ عَلَى مَدِّ الْبُحَيْرَةِ وَ الْجَزْرِ	میرے آنسو جو شہر واسط کی مصیبت میں جاری ہیں خلیج فارس کے مدوجزر کو اور بڑھا دیتے ہیں۔
وَهَبْ اَنَّ دَارَ الْمُلْكِ تَرْجِعُ عَامِراً وَ يُغْسَلُ وَجْهُ الْعَارِفِيْنَ عَنِ الْعَفْرِ	فرض کرو کہ دارالخلافہ پھر آباد ہو اور علماء کے چہرے غبارِ ذلّت سے پاک کیے جائیں۔

فَـأَيْـنَ بَـنُـو الْـعَـبَّـاسِ مُفْتَخَرُ الْوَرٰى
ذَوُوالْخُلُقِ الْمَرْضِيِّ وَ الْغُرَرِ الزُّهْرِیٰ

لیکن بنی عباس جن سے عالم کو فخر تھا جن کے اخلاق برگزیدہ اور پیشانیاں نوارنی تھیں کہاں سے آئیں گے۔

غَـدَا سَـمَـرًا بَيْـنَ الْاَنَـامِ حَـدِيْثُهُـمْ
وَ ذَاسَـمَـرٌ يُدْمِي الْمَسَامِعُ كَالسُّمْرِ

اِن کا ذکر دنیا میں ایک فسانہ ہو گیا اور یہ وہ افسانہ ہے جو کانوں کو برچھیوں کی نوک کی طرح خون آلودہ کرتا ہے۔

وَ فِي الْـخَبَـرِ الْـمَرْوِيِّ دِيْـنِ مُحَمَّدٍ
يَـعُـوْدُ غَـرِيْـبـاً مِّثْـلَ مُبْتَـدَأ الْاَمْرِ

حدیث میں آیا ہے کہ دین محمدی پھر غریب ہونے والا ہے جیسا کہ ابتدائے حال میں وہ غریب تھا۔

ءَ اَغْـرَبُ مِنْ هٰـذَا يَعُوْدُ كَـمَـا بَدَا
وَ سُبِّيَ دَارُ السِّـلْـمِ فِيْ بَـدْءِ الْـكُفْرِ

کیا وہ اِس حالت سے بھی زیادہ غریب ہونے والا ہے کہ تمام دار الاسلام کفر کے آتے ہی غریب ہو گیا۔

اَتُـذْكَـرُ فِـيْ اَعْـلَـى الْمَنَـابِـرِ خُطْبَةً
وَ مُسْتَـعْصِمٌ بِاللّٰهِ لَمْ يَكُ فِي الذِّكْرِ

کیا منبروں پر خطبہ پڑھا جائے گا اور مستعصم باللہ کا اُس میں ذکر نہ ہوگا۔

ضَـفَـادِعُ حَـوْلَ الْـمَـآءِ تَـلْعَبُ فَرْحَةً
اَصَبْرٌ عَـلَـى هٰـذَا وَ يُوْنُسُ فِي الْقَعْرِ

کیا اس پر صبر ہو سکتا ہے کہ مینڈک پانی کے اِدھر اُدھر خوشی سے کھیلتے پھریں اور یونس پانی کی تہ میں ہو۔

تَـحِيَّةُ مُشْتَـاقٍ وَاَلْفُ تَـرَحُّـمٍ
عَـلَـى الشُّهَـدَآءِ الطَّاهِرِيْنَ مِنَ الْوِزْرِ

مشتاق کا سلام اور ہزاروں رحمتیں اُن شہیدوں پر جو گناہوں سے پاک تھے۔

هَـنِيْـئـاً لَّهُـمْ كَـاسُ الْـمُـنِيَّةِ مُتْرِعـاً
وَ مَـا فِيْهِ عِـنْـدَ الـلّٰـهِ مِنْ عَظْمِ الْاَجْرِ

موت کا لبالب پیالا اور جو کچھ کہ اُس میں خدا کی طرف سے اجر عظیم ہے اُن کو گوارا ہو جیو۔

عَلَيْهِمْ سَلاَمُ اللّٰهِ فِیْ كُلِّ لَيْلَةٍ
بِمَقْتَلِ زَوْرَآءَ اِلٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ

ہمیشہ اُن پر شام سے صبح تک زورا کی قتل گاہ میں خدا کی رحمت نازل رہیو۔

وَ لَيْتَ صُمَاخِیْ صُمَّ قَبْلَ اسْتِمَاعِهٖ
بِهَتْكِ اَسَاتِيْرِ الْمَحَارِمِ فِی الْاَسْرِ

کاش ایسا ہوتا کہ قید میں محلوں کے بے پردہ ہونے کی خبر سننے سے پہلے میرے کان بہرے ہوجاتے

كَاَنَّ صَبَاحَ الْاَسْرِ يَوْمُ قِيَامَةٍ
عَلٰی اُمَمٍ شُعْثٍ تُسَاقُ اِلَی الْحَشْرِ

قید کی صبح گویا قیامت کا دن تھا کہ اُمتیں سر میں خاک ڈالے ہوئے میدان حشر کی طرف ہکائی جاتی تھیں۔

وَ مُسْتَصْرِخٍ يَا لِلْمُرُوَّةِ فَانْصُرُوْا
وَ مَنْ يُصْرِخُ الْعُصْفُوْرَ بَيْنَ يَدَیْ صَقْرٍ

بہت لوگ فریاد کرتے تھے کہ دُہائی ہے مروت کی کوئی مدد کرو۔ مگر باز کے پنجے میں چڑیا کی فریاد کو کون پہنچتا ہے۔

يُسَاقُوْنَ سَوْقَ الْمَعْزِ فِیْ كَبِدِ الْفَلاَ
عَزَآئِزَ قَوْمٍ لَّا يَعُوْذُوْنَ بِالزَّجْرِ

جو لوگ زجر اور دھمکی سننے کی عادی نہ تھے اُن کے حرم محترم صحرا میں بکریوں کی طرح ہکائے جاتے تھے۔

جُلِبْنَ سَبَايَا سَافِرَاتٍ وُّجُوْهُهَا
كَوَاعِبُ لَا تَبْرُزْنَ مِنْ حُلَلِ الْخُدْرِ

جو لڑکیاں پردہ میں چادروں سے چہرے باہر نہ نکالتی تھیں اُن کے کھلے مُنھ اسیر کرکے لے گئے۔

تَقُوْمُ وَتُخْفُوْا فِی الْمَعَاجِرِ وَ اللِّوٰی
وَهَلْ يَخْتَفِیْ مَشْیُ النَّوَاعِمِ فِی الْوَعْرِ

وہ کھڑی ہوتی ہیں اور چادروں اور ٹیلوں کے ڈھلانوں میں منھ چھپاتی ہیں مگر اُن کٹھن رستوں میں نازنینوں کی چال کب چھپ سکتی ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِكْرِیْ قَبْلَ ذٰلِكَ مَا تَرٰی
فَاُحْدِثَ اَمْرٌ لَا يُحِيْطُ بِهٖ فِكْرِیْ

اِس سے پہلے میری فکر جیسی تھی تو جانتا ہے مگر ایک ایسا امر عظیم حادث ہوا جو میرے فکر کے احاطہ سے باہر ہے۔

وَ بَيْنَ يَدَيْ صَرْفِ الزَّمَانِ وَ حُكْمِهٖ
مُغَلَّلَةٌ اَيْدِي الْقَيَاصِرِ وَ الْجِبْرِ

زمانہ کی گردش اور حکومت کے سامنے شہنشاہوں اور داناؤں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔

نَعُوْذُ بِعَفْوِ اللّٰهِ مِنْ نَّارِ فِتْنَةٍ
تَاَجَّجَ مِنْ قُطْرِ الْبِلَادِ اِلَى الْقُطْرِ

خدا کی پناہ ہے فتنہ کی اُس آگ سے جو دنیا کی ایک جانب سے دوسری جانب تک بھڑکتی چلی گئی۔

بَدَا وَ تَعَالٰى مِنْ خُرَاسَانَ قَسْطَلٌ
فَعَادَ رُكَامًا لَا يَزُوْلُ عَنِ الْبَدْرِ

خراسان سے ایک غبار نمودار ہوکر بلند ہوا اور ایک گھنگھور گھٹا بن گئی جو چاند پر سے ہٹنے والی نہ تھی۔

رَعَى اللّٰهُ اِنْسَانًا تَيَقَّظَ بَعْدَ هُمْ
لِاَنَّ مُصَابَ الزَّيْدِ مُزْجَرَةُ الْعَمْرِو

خدا حمایت کرے اُس شخص کی جو دولت بنی عباس کے بعد خواب غفلت سے بیدار ہوگیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لیے تازیانہ ہے۔

وَ سَآئِرُ مُلْكٍ يَقْتَفِيْهِ زَوَالُهٗ
سِوَى مَلَكُوْتِ الْقَآئِمِ الصَّمَدِ الْوِتْرِ

خدائے بے نیاز و یگانہ کے ملک کے سوا ہر ملک اور سلطنت کے پیچھے اُس کا زوال لگا ہوا ہے۔

اِذَا كَانَ بَعْدَ الْمَوْتِ لَا فَرْقَ بَيْنَنَا
فَلَا تَنْظُرَنَّ النَّاسَ بِالنَّظْرِ الشَّزْرِ

جب کہ مرنے کے بعد ہم سب میں کچھ فرق نہ رہے گا تو لوگوں کو تکبر کی نگاہ سے مت دیکھ۔

وَ جَارِيَةُ الدُّنْيَا نَعُوْمَةُ كَفِّهَا
مُحْسِنَةٌ لٰكِنَّهَا الْكَلْبُ ذُو الظُّفْرِ

کتے کی طرح معشوقہ دنیا کی ہتھیلیاں تو نرم نرم اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن اُس کے ناخن تیز ہیں۔

وَ لَوْ اَنَّ ذَامَالٍ مِنَ الْمَوْتِ خَالِياً
لَكَانَ جَدِيْرًا بِالتَّعَاظُمِ وَ الْكِبْرِ

اگر مال و دولت والا موت سے خالی ہوتا تو البتہ بڑائی اور تکبر کرنے کا مستحق تھا۔

رَبِحْتَ الْهُدٰى اِنْ كُنْتَ عَامِلَ صَالِحٍ
وَ اِنْ لَّمْ تَكُنْ وَ الْعَصْرِ اِنَّكَ لَفِيْ خُسْرٍ

اگر تو نے نیک عمل کیے تو ہدایت کا نفع اُٹھا لیا ورنہ کچھ شک نہیں کہ تو ٹوٹے میں رہا۔

عَلَى الْمَرْءِ عَارٌ كَثْرَةُ الْمَالِ بَعْدَهٗ
وَ اِنَّكَ يَا مَغْرُوْرَ تَجْمَعُ لِلْفَخْرِ

مرنے کے بعد بہت سا مال چھوڑ جانا آدمی کے لیے ننگ کی بات ہے مگر اے غافل تو اُلٹا فخر کے لیے مال جمع کرتا ہے۔

عَفَا اللّٰهُ عَنَّا مَا مَضٰى مِنْ جَرِيْمَةٍ
وَ مَنَّ عَلَيْنَا بِالْجَمِيْلِ مِنَ السَّتْرِ

خدا تعالیٰ ہماری گزشتہ خطائیں معاف فرمائے اور ہمارے عیب بالکل چھپا کر ہم پر احسان کرے۔

خاتمہ

شیخ کے عام حالات اور اُس کی عام شاعری پر اجمالی نظر

شیخ ایک نہایت صحیح المزاج قوی اور جفاکش آدمی تھا۔ اُس کے قویٰ کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اُس نے دس بارہ حج پیادہ پا کیے تھے اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صحرانوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا اور ایک سو بیس کے قریب عمر پائی۔

اُس نے صرف پیادہ پا ہی سفر نہیں کیے بلکہ بعض اوقات ننگے پاؤں چلنے کا بھی اتفاق ہوتا تھا۔ جس طرح اکثر اہلِ سلوک نفس شکنی کے لیے اپنے مشائخ کے اشارے سے سالہا سال ادنیٰ درجہ کے کام اور محنتیں کیا کرتے ہیں اُس نے بھی بیت المقدس اور اُس کے گرد و نواح میں ایک مدت تک سقائی کی تھی۔

اُس کا مذہب جیسا کہ خود اُس کے کلام سے ظاہر ہے تسنن معلوم ہوتا ہے لیکن جس طرح اکثر صوفیہ کی نسبت تشیع کا گمان کیا گیا ہے اُس کو بھی قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں شیعی لکھا ہے۔ ہم اُس کے کسی خاص مذہب کا ثبوت دے کر ایک ایسے شخص کو جو مقبول فریقین ہے ایک گروہ کا مقبول اور دوسرے گروہ کا مردود بنانا نہیں چاہتے۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ بے تعصب تھا اور یہی اُس کے ناجی ہونے کی دلیل ہے۔

اُس کو تذکرہ نویسوں نے اہلِ باطن اور صوفیہ میں سے شمار کیا ہے اُس کے کلام سے بھی جا بجا یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اُس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بے شک وہ صوفی بھی تھا مگر آج کل کے مشائخ اور واعظین کے برخلاف ایک نہایت بے تکلف، کھلا ڈُلا، یار باش، ہنسوڑ، ظریف، ریا اور نمائش سے دور سیدھا سادہ مسلمان تھا۔ اُس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تئیں لوازم بشریت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور بہ تکلف مقدس فرشتوں کی صورت میں

جلوہ گر ہونا ہرگز نہ آتا تھا۔ وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا مگر مشرق کے عام شعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا۔ اُس نے مثل ظہیر، رشید، خاقانی اور انوری وغیرہم کے بادشاہوں کی مدّاحی اور امیروں کی بھٹئی کرنے کو اپنی وجہ معاش نہیں بنایا تھا۔ بایں ہمہ وہ امرا اور سلاطین سے ملتا بھی تھا اور اُن کی مدح میں قصیدے بھی لکھتا تھا اور جو کوئی عقیدت یا محبت سے اُس کی کچھ نذر کرتا تھا وہ لے بھی لیتا تھا۔ اُس کے عام مدحیہ قصائد دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ یہ قصیدے کس غرض سے لکھتا تھا زیادہ تر اُس کے قصیدے ایسے ہیں جن کو قصیدہ گوئی کے مشرقی اصول کے موافق بہت مشکل سے قصیدہ کہا جا سکتا ہے۔ امیروں سے وہ اس لیے بھی زیادہ تر میل جول رکھتا تھا کہ اکثر اُس کی سفارش سے جیسا کہ گلستان کی بعض حکایتوں سے پایا جاتا ہے غریب آدمیوں کے کام نکل جاتے تھے۔ خودداری اور غیرت اُس میں ایسی تھی کہ نہایت ضرورت اور احتیاج کے وقت بھی وہ وضع کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا جیسا کہ اسکندریہ کے قحط میں اُس سے ظہور میں آیا۔ خلقتِ کی خیر خواہی اور ہمدردی خدا تعالیٰ نے اُس کی سرشت میں ودیعت کی تھی۔ اُس کے نصائح اور مواعظ ہرگز اس قدر مقبول نہ ہوتے اگر انسانی ہمدردی کا جوش اُس کے دل میں نہ ہوتا۔ اُس نے اپنی زبان اور قلم کو پند و نصیحت کے لیے وقف کر دیا تھا اور حق بات کہنے سے خطرناک موقعوں پر بھی نہ چوکتا تھا کوئی شخص کسی چیز میں کامل نہیں ہو سکتا جب تک دو باتیں جمع نہ ہوں ایک جوہر فطری دوسرے زمانہ کے ایسے اتفاقات جو اُس کے جلا کا باعث ہوں۔ شیخ کی ذات میں جس قسم کی قابلیت تھی اُسی کے موافق اُس کو اتفاقات پیش آئے تھے۔ جس شہر میں پیدا ہوا تھا وہ خود ایک مردم خیز خطہ تھا جہاں ہونہار بچوں کو خود بخود کسب کمال کی ترغیب ہونی چاہیے۔ یتیمی اور بے پدری اگرچہ اکثر صورتوں میں آوارگی اور ابتری کا سبب ہوتی ہے لیکن بسا اوقات ایسی مجبوری اور بیکسی کی حالتیں غیرت مند اور جفاکش لڑکوں کے حق میں ترقی اور رشد کا باعث ہوئی ہیں۔ جس مدرسہ میں وہ حسنِ اتفاق سے تحصیل کے لیے پہنچا۔ وہ تمام مدارس اسلامیہ میں ممتاز اور سربرآوردہ تھا اور جس دارالخلافہ میں وہ مدرسہ واقع تھا وہاں کی سوسائٹی اُس وقت تقریباً تمام دنیا کی سوسائٹیوں کی نسبت زیادہ شایستہ اور مہذب تھی۔ اُس نے صرف درس و کتاب ہی سے استفادہ حاصل نہیں کیا تھا بلکہ زمانہ نے بھی اُس کی تادیب خاطر خواہ کی تھی۔ اُس کی عمر کا ایک

بہت بڑا اور مفید حصّہ نہایت کٹھن اور دور دراز سفر کرنے اور دنیا کی عجائبات اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے میں بسر ہوا تھا۔ سلطنتوں کے پے در پے انقلابات اور ملکوں کے متواتر تغیرات، ظالم بادشاہوں اور بے رحم عاملوں کے ظلم وستم دیکھتے دیکھتے بنی نوع کی دل سوزی اور ہمدردی اُس کی طبیعت میں راسخ ہوگئی تھی۔ بیسیوں خاندان اُس کی آنکھوں کے سامنے بنے اور بیسیوں بگڑ گئے۔ ایکبار جیسا کہ گلستان میں مذکور ہے شام میں اُس کے روبرو ایسا انقلاب ہوا کہ وزیروں کی اولاد بھیک مانگنے لگی اور روستائی زادے وزارت کے درجہ کو پہنچ گئے۔ ساتویں صدی میں جس میں کامل عقل و ہوش کے ساتھ اُس نے اکیانوے برس بسر کیے تھے عجیب وغریب تماشے اس کی نظر سے گزر گئے۔ سلاطین کردیہ کا خاندان جن کی سعادت و جلالت، ایشیا، افریقہ اور یورپ میں یکساں مانی جاتی تھی اُسی صدی میں تمام ہوا۔ سلاجقہ، تونیہ اور خوارزم شاہیوں کی نہایت سخت لڑائی جس نے دونوں سلسلوں کو مضمحل کردیا۔ اِسی صدی میں ہوئی۔ پھر خوارزمیوں کی سلطنت بحیرہ خرز اور جھیل یورال سے دریاے سندھ اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی اِسی صدی میں تاتاریوں [1] کے ہاتھ سے برباد ہوئی۔ بنی عباس کی خلافت سوا پانسو برس بعد اسی صدی میں ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہوئی اور بقول بعض مورخین کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خون مغلوں کی تلوار سے دجلہ کی ریتی میں بہہ گیا۔ دمشق اور اسکندریہ کا قحط جس کا ذکر گلستان اور بوستان میں ہے اور مصر کا قحط جس میں حسب تصریح صاحب وصاف ایک ایک روٹی ہزار ہزار دینار کو بک گئی اور فارس کا قحط جس میں ایک لاکھ آدمی بھوکا مرگیا۔ اسی صدی میں واقع ہوئے۔ اتابکان فارس کے خاندان پر اسی صدی میں زوال آیا دارالملک شیراز جو شیخ کا مولد و مسکن تھا اسی صدی میں کئی بار قتل و غارت کیا گیا۔ فرقۂ اسمٰعیلیہ جو پونے دوسو برس مشرق میں نہایت زور وشور کے ساتھ حکمراں رہا اِن کا خاتمہ تاتاریوں نے ایران میں اور کُردوں نے شام میں ہمیشہ کے لیے اسی صدی میں کیا۔ یہ تمام حوادث اور وقایع شیخ کے سامنے ظہور میں آئے تھے جن سے ایک صاحب بصیرت آدمی

1۔ اس معرکہ میں جیسا کہ شیخ نجم الدین دایہ نے مرصاد العباد کے دیباچہ میں لکھا ہے تاتاریوں نے صرف رَے اور اُس کے گردونواح میں تقریباً سات لاکھ مسلمان قتل اور اسیر کیے تھے اور خراسان کے چار شہر بلخ، مرو، ہرات اور نیشاپور بالکل تاراج اور نابود ہوگئے اور اُن کے دائیں بائیں اکثر بستیاں قتل و غارت کا نشانہ ہوئیں۔

بے انتہا عبرت اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ بغداد کا مرثیہ جو اُس نے عربی میں لکھا ہے اُس میں کہتا ہے۔

رَعی اللہ اِنْسَاناً تَیَقَّظَ بَعْدَ ھُم　　　لانَّ مُصَابَ الزَّیْدِ مُزْجِرَۃُ العَمْرو

یعنی: خدا حمایت کرے اس شخص کی جو خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد متنبہ ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لیے تازیانہ ہے۔ یوروپ کے مشہور مصنف ہگ ملر صاحب کا قول ہے کہ میں نے عمدہ تعلیم صرف ایک اسکول یعنی مدرسۂ روزگار میں پائی ہے جس میں محنت اور مصیبت دو بڑے گرم جوش اور دل سوز اُستاد تھے۔

اِس کے سوا جیسی عمدہ صحبتیں شیخ کو میسر آئی تھیں ویسی بہت کم آدمیوں کو میسر آتی ہیں۔ شیخ کی عادت جیسا کہ ایک رسالہ [1] میں اُس کے فحوائے بیان سے معلوم ہوتا ہے یہ تھی کہ عالم سفر میں وہ جہاں جاتا تھا وہاں کے علماء، صلحا، مشائخ اور کاملین سے ضرور ملتا تھا۔ صاحب نفحات الانس نے لکھا ہے کہ شیخ نے کثرت سے دانشمندوں اور عالموں کو دیکھا تھا۔ وہ خود بھی بوستان میں لکھتا ہے۔

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم　　　ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

اگرچہ ساتویں صدی ہجری میں جس میں کہ شیخ کی جوانی اور بڑھاپا گزرا تھا مسلمانوں کی علمی ترقیات اور فضائل و کمالات سابق کی نسبت بہت محدود ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی بلادِ اسلام میں ایک جم غفیر اعلیٰ درجے کے مشائخ اور علماء و حکماء کا نظر آتا تھا۔ خصوصاً جن ملکوں میں شیخ کی زیادہ آمد و رفت رہی ہے جیسے ایران، روم، شام، عراق، عرب اور مصر وغیرہ وہ اب بھی دینی اور دنیوی علوم کے مرکز تھے ہمارے تذکروں سے ثابت ہوتا ہے کہ اِن ملکوں میں جن لوگوں نے ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے آٹھویں صدی کے شروع تک وفات پائی ہے اور جن سے شیخ کا ملنا ممکن تھا اُن میں کم سے کم چار سو جلیل القدر عالم اور محقق ایسے موجود تھے جو تمام بلادِ اسلام میں مانے گئے ہیں اور جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں نہایت عظمت کے ساتھ تسلیم کی جاتی ہیں۔ جیسے شیخ محی الدین ابن العربی، خواجہ نصیر الدین

1۔ یہ رسالہ شیخ کی کلیات میں شامل ہے۔

طوسی، شیخ صدرالدین قونوی، مولانا جلال الدین رومی، ابن تمیمیہ حرانی، امام یافعی، شیخ ابوالحسن شاذلی، شیخ تاج الدین قسطلانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ ابن فارض، شیخ اوحدالدین کرمانی، قاضی ابن خلکان شیخ الاسلام تقی الدین ابن الصلاح، خواجہ علاءالدین سمنانی، علامہ قطب الدین شیرازی، امام محی الدین نووی، قاضی ناصرالدین بیضاوی ابن عساکر فقیہ شافعی وغیرہ وغیرہ ایسے ایسے سینکڑوں جلیل القدر علماء اور مشائخ شیخ کی نظر سے گزرے تھے اور اِن کے علاوہ جیسا کہ گلستان اور بوستان سے ثابت ہوتا ہے وہ ہر فرقہ اور ہر گروہ کے آدمیوں سے ملتا اور اُن کی صحبت سے فائدہ حاصل کرتا تھا جس طرح وہ فقرا اور مشائخ کے حلقوں میں بیٹھتا تھا۔ اُسی طرح امرا کی مجلسوں اور بادشاہوں کے دربار میں شریک ہوتا تھا اور کبھی وہ احرار اور ابرار کی صحبت سے مستفیض ہوتا تھا اور کبھی اوباش والواط کے جلسوں کا تماشائی تھا۔ نہ اُس کو شراب خانے میں جانے سے عار تھا نہ بت خانے میں رہنے سے ننگ تھا۔ اسی نے جامعِ بعلبک میں مدتوں وعظ کہا تھا اور وہی بت خانہ سومنات میں ایک مدت تک پجاری رہا۔ کبھی وہ بصرہ کے نخلستان میں یاروں کے ساتھ کھجوریں توڑتا نظر آتا تھا اور کبھی فلسطین کی بستیوں میں پیاسوں کو پانی پلاتا پھرتا تھا۔ غرضِ کہ اُس کی تمام عمر فضائل انسانی اور نیرنگی روزگار کے مطالعہ میں بسر ہوئی تھی۔ اسی سبب سے یورپ کے بعض مصنفوں نے اسکوگریٹ مورلسٹ کہا ہے اور اسی وجہ سے اخلاق بشری کی تصویر جس عمدگی کے ساتھ اِس نے اپنے کلام میں کھینچی ہے ویسی آج تک ایران کے کسی شاعر سے نہیں کھچ سکی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شعرائے ایران میں جس قدر عمر شیخ نے پائی ہے ظاہراً اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ جہاں تک ہماری تحقیق سے ثابت ہوتا ہے اس نے ایک سو بیس (120) برس اس قفس عنصری میں بسر کیے ہیں۔ اگرچہ ہر علم وفن میں کمال کا درجہ حاصل کرنے کے لیے زیادہ عمر پانی ضرور ہے۔ مگر شاعر کے لیے سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے۔ شاعر جس قدر بڈھا ہوتا جاتا ہے شاعری جوان ہوتی جاتی ہے اگرچہ شیخوخت کے مرتبہ کو پہنچ کر شاعر کے فکر میں بلند پروازی نہیں رہتی۔ لیکن بلاغت جو شاعری کا رکن اعظم ہے کمال کو پہنچتی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ جن شاعروں نے تھوڑی عمر پائی ہے گوکہ اُن کی قابلیت واستعداد اعلیٰ درجہ کی تھی مگر اُن کی شاعری میں ضرور کچھ نہ کچھ نقصان رہ گیا۔ جیسا کہ عرفی شیرازی کی نسبت

شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے ''غنچہ استعدادش ناشگفتہ ماند'' ایک نوجوان شاعر جس کی طبیعت میں کمال جودت اور بلند پروازی ہو بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شوخ چالاک اُلھڑ بچھیرا جس کی بھاگ دوڑ اور جست وخیز اکثر بے اصول اور خلاف قاعدہ ہوتی ہے اور ایک معمر سن رسیدہ شاعر گو اُس کی فکر کیسی ہی پست اور محدود ہو اُس شایستہ اور سدھ منی گھوڑے کے مانند ہے جو کبھی بے اصول قدم نہیں اُٹھاتا۔ الغرض شاعری کے لیے جتنی ضروری شرایط درکار ہیں وہ سب خدائے تعالیٰ نے شیخ کی ذات میں جمع کر دی تھیں۔

شاعری کی بنیاد زیادہ تر چار چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ شاعر کے خیالات کم وبیش کسی حقیقت واقعیہ پر نہ کہ محض اختراع ذہن پر مبنی ہونے چاہئیں ورنہ شعر میں کچھ تاثیر نہ ہوگی۔ دوسرے وہ ایسے خیالات ہوں جن میں عام خیالات کی نسبت ایک قسم کی ندرت اور نرالا پن اور تعجب پایا جائے ورنہ معمولی بات چیت میں اور شعر میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ خیالات عمدہ لباس میں ظاہر کیے جائیں۔ کیونکہ خیال کیسا ہی عمدہ ہو اگر مناسب لفظوں میں ادا نہ کیا جائے تو دائرۂ شاعری سے خارج ہوگا۔ چوتھے شاعر کے دل میں جب کہ وہ کسی مضمون پر شعر لکھ رہا ہے کم وبیش اُس مضمون کا جوش اور ولولہ موجود ہونا چاہیے۔ ورنہ شعر نہایت کمزور ہوگا یہ چاروں باتیں جیسی شیخ کی شاعری میں پوری پوری پائی جاتی ہیں ویسی ایران کے کسی اور شاعر میں مشکل سے پائی جائیں گی۔ اگرچہ بعض کے کلام میں یہ تمام خاصیتیں موجود ہیں لیکن اُن کا کلام چونکہ نہایت محدود اور ایک خاص صنف میں منحصر ہے جیسے خواجہ حافظ شیراز کی غزل۔ اس لیے ہم اُن کو شیخ کا ہم پلہ نہیں سمجھتے۔

شیخ کو اور شعرا پر اس سبب سے بہت بڑی فوقیت ہے کہ اِس کی نظم ونثر دونوں مسلّم الثبوت ہیں۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوگی کہ ایران میں جتنے مسلّم الثبوت شعرا گزرے ہیں اُن میں شیخ کے سوا ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی نثر کو مثل نظم کے جمہور نے تسلیم کیا ہو۔ اگرچہ ہندستان میں نورالدین ظہوری کو بھی نظم ونثر کا جامع مانتے ہیں لیکن اہل ایران اُس کی نظم ونثر دونوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ بیشک اُس کی سہ نثر کے اکثر فقرے بادی النظر میں نہایت دلفریب ہیں جیسے۔

سنبل حرفش از آہِ ناشکیبان بنفشہ نقطہ اش از خالِ دلفریبان

''از شیخ طراوت کلمات نہر سطر مالال آبِ حیاتِ خضر تشنہ لب سیرابی ادا مسیحا مردۂ جان بخشی ہوا نکتہ ہائے برجستہ غنچہ ہائے سربستہ۔ نثرش نثرہ رفعت۔ شعرش شعری مرتبت ہر صفحہ چمنے و ہر سطرے نخلے برگش لفظ دلکش و بارش معنی بے غش ہر حرفش فصلے و ہر فرعش اصلے'' اسی طرح سے نثر کے اور بہت سے فقرے الفاظ پرستوں کو نہایت خوشنما معلوم ہوتے ہیں لیکن اِن میں الفاظ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

خوب اند و خوش اند و بوندارند

بخلاف اِس کے شیخ نے گلستان میں اِس سے بہت زیادہ دلآویز و دلکش الفاظ میں حقائق واقعیہ کو بیان کیا ہے یہ بات گلستان کے سوا کسی فارسی نثر میں آج تک نہیں دیکھی گئی۔ مثلاً '' در ایّام جوانی چنانکہ افتد و دانی، نظرے داشتم بہ روے و گزرے داشتم بہ کوے، (2) اے برادر حرم در پیش و حرامیان از پس اگر رفتی بردی و اگر خفتی مردی (3) آزردن دلِ دوستان جہل ست و کفارۂ یمین سہل (4) تو کہ چراغ نہ بینی بچراغ چہ بینی (5) طریق درویشان ذکر ست و شکر و خدمت و طاعت و ایثار و قناعت و توحید و توکل و تسلیم و تحمل۔ ہر کہ بدین صفتہا موصوف است بحقیقت درویش ست۔ اگرچہ در قبا است۔ امّا ہرزہ گردے بے نمازے ہوا پرستے ہوس بازے کہ روزہا بہ شب آرد در بند شہوت و شبہا روز کند در خواب غفلت و بخورد ہر چہ درمیان آید و بگوید انچہ بر زبان آید زندیق ست اگر چہ در عبا ست (6) پدر را عسل بسیار است اما پسر گرمی دار ست (7) صیاد بے روزی در دجلہ ماہی نگیرد و ماہی بے اجل بر خشکی نمیرد (8) گوئی خردۂ مینا بر خاکش ریختہ و عقدِ ثریا از تاکش درآویختہ (9) عصارۂ تاکے بقدر تش شہد فائق شدہ و تخم خرما بہ یمن تربیتش نخل باسق گشتہ۔''

نظم و نثر کے جامع فارسی زبان ہی میں نادر الوجود نہیں ہیں بلکہ ہر زبان میں یہی حال ہے انگریزی میں باوجودیکہ لٹریچر کی ترقی انتہا کے درجے کو پہنچ گئی ہے صرف گنتی کے آدمی ایسے ہیں جن کو نظم اور نثر دونوں میں تمام اہل فن کے نزدیک قبولیت حاصل ہوئی ہے بعضے ملٹن کو اور بعضے مسکاٹ کو اور بعضے اور ایک آدھ آدمی کو نظم و نثر کا جامع خیال کرتے ہیں، پس شیخ کے لیے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے کہ ایران میں صرف اُسی کی نظم و نثر ایسی ہیں جن کو تمام

اہلِ زبان نے تسلیم کیا ہے۔

شیخ نے بھی تغزل یعنی عاشقانہ اشعار کی بنیاد تمام شعرائے ایران کی طرح امردوں اور سادہ رخوں کے عشق ہی پر رکھی ہے۔ لیکن یہ بات جیسی کہ بادی النظر میں مذموم اور قبیح معلوم ہوتی ہے حقیقت میں ایسی نہیں ہے اور صرف اسی بنا پر شیخ یا ایران کے اور شعرا پر امرد پرستی کا الزام لگانا بیجا ہے۔ فارسی زبان میں اور اُس کی پیروی سے اُردو زبان میں بھی ہمیشہ سے شاعری کا یہ طریقہ رہا ہے کہ شاعر مرد ہو یا عورت، رند ہو یا صوفی، خدا کا عاشق ہو یا مخلوق کا۔ مرد کا عاشق ہو یا عورت کا بلکہ سرے سے عاشق ہو یا نہ ہو ہمیشہ غزل ایسے عنوان سے لکھتا ہے جس سے معلوم ہو کہ شاعر کسی پر عاشق ہے اور وہ اور اُس کا معشوق دونوں مرد ہیں۔ اسی طرح ہندی میں شاعر مرد ہو یا عورت۔ دنیا دار ہو یا تارک دنیا، عشق حقیقی رکھتا ہو یا عشق مجازی، مرد کا عاشق ہو یا عورت کا ہمیشہ عاشقانہ نظم ایسے طور پر لکھتا ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ شاعر عورت ہے اور اُس کا معشوق مرد ہے۔ اِس طرح عربی میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت فرض کر لیتا ہے۔ اگر بالفرض کوئی شخص تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر قادر ہو تو اُس غریب کو ہر زبان کے دستور کے موافق کہیں آپ کو مرد اور معشوق کو عورت اور کہیں آپ کو عورت اور معشوق کو مرد کہیں آپ اور معشوق دونوں کو مرد قرار دینا پڑے گا۔ حضرت امیر خسرو دہلوی کی فارسی کی غزلوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ کسی سادہ رُخ لڑکے پر مفتون ہیں اور اُن کے ہندی دوہروں سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی عورت اپنے پیارے خاوند یا دوست کے عشق یا جدائی میں بیتاب ہے اور عربی قصائد کی تشبیہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرد اپنی زوجہ یا محبوبہ کی یاد میں مضطر و بیقرار ہے۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام فرضی اور اصطلاحی عنوان بیان ہیں جن کو حقیقتِ واقعی سے کچھ علاقہ نہیں ہے جس طرح ہزاروں پارسا اور پرہیزگار شاعر جنھوں نے نہ کبھی شراب کا مزا چکھا نہ اُس کی صورت دیکھی نہ اُس کی بو سونگھی صدہا شعر شراب و کباب کے مضمون کے لکھتے ہیں۔ اسی طرح ہزاروں پاکباز اور صاحب عفت شعر لکھتے وقت تھوڑی دیر کو امرد پرست اور شاہد باز بن جاتے ہیں۔ البتہ اس سے مشرقی شاعری کی حد سے زیادہ بے اعتباری پائی جاتی ہے۔ جس کے اصول اور فروع سب تصنع اور بناوٹ اور ادعائے محض پر مبنی ہیں۔ لیکن شیخ سعدی اور مولانا روم اور امیر خسرو

اور خواجہ حافظ اور تمام شعرائے متصوفین اِس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ یہ لوگ اکثر عشق مجازی کے پیرایہ میں اپنے واردات اور حالات اور حقائق واقعیہ بیان کرتے ہیں۔ بعض اشخاص یہ خیال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے کلام کو جس میں بظاہر تمام خال وخط اور شراب وشاہد کے مضامین درج ہیں حقیقی معنوں پر محمول کرنا اور اِس سے شاہدِ حقیقی کے شیون وصفات مراد لینی صرف ایک ملّایانہ گھڑت ہے جس میں سراسر تکلف اور بناوٹ پائی جاتی ہے۔ مگر ایسا خیال وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کوچۂ شاعری سے نابلد ہیں۔ کنایہ ہمیشہ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے اور دوست کا ذکر ہمیشہ اغیار سے چھپایا جاتا ہے چنانچہ حضرت مولانا روم مثنوی میں صاف صاف فرماتے ہیں۔

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران گفتہ آید در حدیث دیگران

شعرائے متصوفین کے اشعار اگر حقیقی معنوں پر محمول نہ کیے جائیں تو اُن میں وہ کرشمہ جس نے ایک عالم کے دل کو تسخیر کیا ہے باقی نہیں رہتا۔ نفحات الانس میں لکھا ہے کہ مولانا محمد شیریں جو کہ مولانا مغربی کے نام سے مشہور ہیں اور جن کا دیوان غزلیات متصوفانہ اشعار میں مشہور ہے اُن کے سامنے کسی نے اُن کے معاصر شیخ کمال اسمٰعیل خجندی کا یہ مطلع پڑھا۔

چشم اگر این است ابرو این و ناز وعشوہ این الوداع اے زہد وتقویٰ الفراق اے عقل ودین

مولانا نے سن کر کہا ایسا شعر کہنا کیا ضروری ہے جو معنی مجازی کے سوا کوئی اور محل نہ رکھتا ہو۔ شیخ نے بھی یہ بات سنی اور ایک موقع پر مولانا کے سامنے ذکر چھیڑ کر کہا کہ چشم اور عین مرادف لفظ ہیں پس عین سے ذات الٰہی مراد لی جاسکتی ہے اور ابرو حاجب کا مرادف ہے پس ممکن ہے کہ حاجب سے صفات الٰہی جو کہ حاجبِ ذات میں مراد لی جائیں۔ مولانا نے اِس توجیہ کو تسلیم کیا اور شیخ کے بیان کی داد دی خواجہ حافظ کی نسبت اُسی کتاب میں لکھا ہے کہ ''یہ شخص لسان الغیب اور ترجمان اسرار ہے اُس نے اکثر اسرار غیبی اور معانی حقیقی مجاز کے لباس میں ایسی خوبی سے بیان کیے ہیں کہ کسی اور سے ایسا بیان نہیں ہوسکا'' پھر اکابر صوفیہ میں سے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے جو کہ صوفیہ کے حق میں دیوانِ حافظ کو تمام دیوانوں سے بہتر بتاتے تھے۔ لیکن حق یہ ہے کہ تغزل کا یہ طریقہ خواجہ حافظ وغیرہ نے شیخ سعدی شیرازی کے تتبع

سے حاصل کیا ہے۔

البتہ ایران کی شاعری میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اُنھوں نے تغزل کی بنیاد امرد پرستی پر کیوں رکھی ہے۔ عرب کی شاعری میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت اور ہندی میں اپنے کو عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہیں اور یہ دونوں طریقے نیچر کے مطابق ہیں۔ مگر مرد کا مرد پر عاشق و فریفتہ ہونا اور اُس سے وصل کا طالب اور کا مجو ہونا اگر چہ محض زبانی جمع خرچ کیوں نہ ہو ایک ایسا طریقہ ہے جس سے فطرت انسانی بالکل ابا کرتی ہے ہمارے نزدیک اِس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں عربی اور ہندی زبان کی طرح تذکیر و تانیث کا تفرقہ نہیں ہے۔ اس میں ضمیریں اور افعال اور صفات مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں لائی جاتی ہیں۔ پس ممکن ہے کہ قدیم فارسی میں بھی ہندی کی طرح شعرا اپنے تئیں عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہوں لیکن اِس سبب سے کہ شاعر عموماً مرد ہوتے تھے اور ضمائر یا افعال وغیرہ سے ثابت نہ ہوتا تھا کہ شاعر نے اپنے تئیں مرد فرض کیا ہے یا عورت۔ رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ فارسی میں عاشق و معشوق دونوں مرد فرض کیے جاتے ہیں۔ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر کامل غور اور توجہ سے دیکھا جائے تو یہ ایک ایسی توجیہ ہے جس کے صحیح ہونے میں کچھ تھوڑا ہی سا شبہ باقی رہ جاتا ہے۔ اس کے سوا دوسری وجہ یہ بھی خیال میں آتی ہے کہ جب مسلمان عرب سے نکل کر اطراف و جوانب میں پھیلے تو بسبب اِس کے کہ ان کے ہاں عورتوں کا مردوں سے چھپانا مذہبی فرایض میں سے تھا، غیر قوموں کے میل جول سے عورتوں کے باب میں اُن کی غیرت حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ خصوصاً مسلمان بادشاہوں میں اِس غیرت کا ظہور سب طبقوں سے زیادہ تھا۔ ڈاکٹر برنیر فرانسیسی جو ہندستان میں پندرہ سولہ برس عالمگیر کے ساتھ رہا اپنے وقائع میں لکھتا ہے ''ہندستان میں جب بادشاہ سفر کرتا تھا تو بیگمات کی سواری کے نزدیک کوئی متنفس اگر چہ کیسا ہی ذی رتبہ اور صاحب اختیار ہو نہیں جانے پاتا تھا ورنہ بالضرور خواجہ سراؤں اور خواصوں کے ہاتھ سے نہایت بے رحمی کے ساتھ پٹتا تھا اور ایران میں سنا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص بیگمات کی سواری سے آدھے فرسنگ کے فاصلے پر نظر پڑ جاتا تھا تو اُس کی سزا موت کے سوا کچھ نہ تھی اور جس شہر یا گانوں میں سے بیگمات کی سواری نکلتی تھی وہاں کے تمام مرد اور عورت اپنے اپنے مقام اور مسکن چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔'' شاید اس بیان

میں کچھ مبالغہ ہو مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے باب میں مسلمان بادشاہوں کی غیرت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ چونکہ شعرا اکثر بادشاہوں کے مداح اور مصاحب ہوتے تھے اس لیے وہ کوئی بات سلاطین کے مقتضائے مزاج کے خلاف شعر میں درج نہ کر سکتے تھے۔ پس نہایت قوی گمان ہے کہ شعرا نے غزل اور تشبیب میں عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر اور جو جو معاملات عشق کے زمانہ میں عاشق و معشوق کے درمیان واقع ہوتے ہیں اُن کو صاف صاف بیان کرنا سلاطین کی حمیّت اور غیرت کے برخلاف سمجھا ہو اور اِس لیے تمام عشقیہ مضامین امردوں اور سادہ رُخوں پر ڈھالے گئے ہوں۔ سلاطین مغلیہ میں سے جہانگیر کے عہد میں جو ایک واقعہ گزرا ہے وہ اِس خیال کی تائید کرتا ہے۔ ایک موقع پر جہانگیر کے روبرو قوال امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی غزل گا رہا تھا اور بادشاہ اُس کو سن کر بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ جب قوال نے یہ شعر گایا۔

تو شبانہ می نمائی بہ برِ کہ بُودی امشب   کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد

بادشاہ دفعتاً بگڑ گیا اور قوّال کو فوراً پٹوا کر نکلوا دیا اور اس قدر برہم ہوا کہ تمام ندیم اور خواص خوف سے لرزنے لگے اور فوراً ملاّ نقشی مہر کن کو جن کا بادشاہ بہت لحاظ کرتا تھا بُلا کر لائے تا کہ وہ کسی تدبیر سے بادشاہ کے مزاج کو دھیما کریں۔ جب وہ سامنے آئے تو بادشاہ کو نہایت غیظ و غضب میں بھرا پایا۔ عرض کیا حضور خیر باشد۔ بادشاہ نے کہا دیکھو امیر خسرو نے کیسی بے عزتی کا مضمون شعر میں باندھا ہے۔ بھلا کوئی غیرت مند آدمی اپنی محبوبہ یا منکوحہ سے ایسی بے غیرتی کی بات کہہ سکتا ہے؟ مُلاّ نقشی نے ایک نہایت عمدہ توجیہ سے اُسی وقت بادشاہ کا غصہ فرو کر دیا۔ اُنھوں نے کہا کہ امیر خسرو نے چونکہ ہندستان میں نشو و نما پایا تھا اس لیے وہ اکثر ہندستان کے اصول کے موافق اشعار کہتے تھے یہ شعر بھی اُنھوں نے اُسی طریقہ پر کہا ہے۔ گویا عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ تو رات کو کسی غیر عورت کے ہاں رہا ہے کیونکہ اب تک تیری آنکھوں میں نشہ یا نیند کا خمار پایا جاتا ہے۔ یہ سن کر بادشاہ کا غیظ و غضب فوراً جاتا رہا۔ اور پھر گانا بجانا ہونے لگا۔

اگرچہ شیخ یا اور شعرائے ایران کے عاشقانہ اشعار سے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اُن کی امرد پرستی اور شاہد بازی پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ لیکن اِس میں شک نہیں کہ گلستان کے

پانچویں باب کی بعض حکایتوں اور نیز شیخ کے اکثر اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ عشق و محبت اُس کی سرشت میں تھا اور کسی نہ کسی وقت میں اُس کو سادہ رُخوں اور امردوں کی طرف میلان خاطر رہا ہے۔ مگر اس بات کو میں کسی بُرے معنی پر محمول نہیں کرتا۔ صوفیہ کے حالات جو نفحات وغیرہ میں لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک عشق مجازی بشرطیکہ پاک اور بے عیب ہو سالک کے لیے ایک بہت بڑا ذریعہ ترقی باطنی کا ہے اور اکثر بڑے بڑے مشائخ اور عرفاء میں یہ خصلت پاکدامنی اور عفت کے ساتھ دیکھی گئی ہے۔ شیخ نے جس طرح اپنے عاشق مزاج ہونے کا جابجا اقرار کیا ہے اُسی طرح ناپاک عشق بازی اور ہوا و ہوس سے بیسیوں جگہ اپنی براءت بھی کی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ غزل میں کہتا ہے۔

گر نظرِ صدق را نام گنہ می نہند　　　حاصل ما ہیچ نیست جز گنہ اندوختن

تمت بالخیر